

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

دن بہر حال ”بارہ گھنٹے“ میں ختم ہو جائے گا
خواہ آپ اس کو استعمال کر رہے ہوں یا برباد

قیمت فی پرچہ	۲۴	شمارہ ۵
زرتعاون سالانہ ۲۴ روپے		
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے		
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی		
دو روپے		فروری ۱۹۷۹

تعمیر ملت

از
مولانا وحید الدین خاں

اشاعت اول
قیمت

۱۹۷۹
دو روپے

دوسروں کو

اپنی بربادی کا

ذمہ دار قرار دینا

صرف اس بات کا

ثبوت ہے کہ

آدمی اپنے

امکانات سے

باخبر نہ ہو سکا

قدرت کا سبق

گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے
لئے جگہ حاصل کر لیتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے
بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف بہہ کر
اپنا راستہ بنالیتا ہے۔ درخت سطح کے اوپر
قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین پھاڑ کر اس سے
اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرتا ہے۔

ناشر مکتبہ الرسالہ

جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

طابع جے۔ کے آفٹ پرنٹرز دہلی

بسم الله الرحمن الرحيم

راقم الحروف کو ایک بار ایک مسلم ادارہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنا قائم کیا ہوا ”صنعتی مدرسہ“ دکھایا جو ان کے وسیع مکان کے ایک حصہ میں واقع تھا۔ اس مدرسہ میں مسلم لڑکیوں کو کپڑے کی کڑھائی کا کام سکھایا جاتا تھا۔ پھر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ یہاں بڑی تعداد میں میزپوش رکھے ہوئے تھے جو پچھلے کئی سالوں میں لڑکیوں نے بنائے تھے۔ ”دیکھئے کتنے اچھے ہیں یہ میزپوش“ انھوں نے پھول دار کڑوں کو دکھاتے ہوئے کہا ”یہ ہماری لڑکیوں نے تیار کئے ہیں۔ مگر یہاں مقامی طور پر ان کا کوئی مارکٹ نہیں۔ آپ ان کو دہلی میں فروخت کر دیں تو ہم اس کے پیسہ کو مدرسہ میں لگائیں اور اس کو مزید ترقی دیں۔“

یہ سادہ سادہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ مشمل کر رہا ہے۔ ہم ”سن مائیکا“ کے دور میں ”میزپوش“ کی تجارت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں زمانہ کے جدید حالات کی خبر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا وجود آج کے زمانہ میں ایک قسم کی قدیم اشیاء کی دکان (Old Curiosity Shop) بن کر رہ گیا ہے جس کو وقتی طور پر خواہ کچھ خاص مزاج کے خریدار مل جائیں۔ مگر جدید دنیا میں اس کو کوئی غالب حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ قویں لیاقت اور امتیاز کے بل پر اپنی جگہ بنا رہی ہیں ہم مراعات اور رزرویشن کا مطالبہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جب کہ دوسرے لوگ سائنٹفک اسلوب میں اپنے ”دین“ کو پیش کر رہے ہیں، ہم شاعرانہ اور خطیبانہ اسلوب کا کمال دکھا رہے ہیں۔ جب کہ لوگ پرامن تدابیر کے ذریعہ اپنی جڑیں مستحکم کر رہے ہیں، ہم توڑ پھوڑ اور اکی ٹیشن میں مصروف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے معجزاتی نتائج برآمد ہوں گے۔

ملت کی تعمیر کے لئے پچھلے سو برس سے پر شور ہنگامے جاری ہیں۔ مگر ملت کا قافلہ ایک قدم بھی آگے بڑھا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ملت کی تعمیر کا مطلب ہمارے یہاں یہ ہے کہ کسی نہ کسی خارجی گروہ کو اپنے مسائل کا ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف تقریر و تحریر کا طوفان برپا کرتے رہنا۔ یہ واقعہ بار بار پیش آرہا ہے کہ حالات ہمارے ایک ”دشمن“ کو ہٹا دیتے ہیں مگر اس کے بعد جو دوسرا آتا ہے وہ بھی ہمارے لئے اتنا ہی، بلکہ اکثر اوقات اس سے زیادہ برا ثابت ہوتا ہے جتنا کہ پہلا تھا۔ مگر ہمارے جوش میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں آتا کہ جو احتجاجی سیاست پہلے ہم ایک کے خلاف چلا رہے تھے، اب اس کو دوسرے کے خلاف چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو اس قسم کی منفی تدبیروں کو ہمیں چھوڑنا ہوگا۔ اپنی تعمیر آپ کرنی ہوگی۔ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے اپنے آپ کو اپنے پچھڑے پن کا ذمہ دار قرار دینا ہوگا۔ اپنے وقت اور پیسہ کو جلسوں اور کانفرنسوں میں برباد کرنے کے بجائے اس کو اپنی تعمیر و ترقی پر لگانا ہوگا۔ غوروں اور تقریروں کی سیاست کو چھوڑ کر خاموش عمل کی سیاست اختیار کرنا ہوگا۔ جو امکانات ضائع ہو چکے ان کا ماتم کرنے کے بجائے نئے مواقع کو استعمال کر کے اپنا سفر جاری کرنا ہوگا۔ خوش فہمیوں کی دنیا سے نکل کر حقائق کی دنیا میں اپنا مستقبل بنانا ہوگا۔ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو اسباب کی اس دنیا میں ہمیں زندگی عطا کرنے والی ہو۔ (۱۹ دسمبر ۱۹۷۸ء)

یہ الفاظ ایک صدی قبل کہے گئے تھے

۱۸۵۷ء کے حالات کے ذیل میں مولانا سید حسین احمد دہلوی لکھتے ہیں: ”قصبہ تھانہ بھون میں حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے۔ وہ علوم غریبہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ علماء دہلی سے تمام نصاب علم ظاہر پڑھ چکے تھے۔ بد قسمتی سے مولانا شیخ محمد صاحب کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ (چنانچہ تھانہ بھون میں اکابر علماء کا ایک اجتماع بلایا گیا جس میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ شریک ہوئے) اجتماع میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوہ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا (نقش حیات، جلد دوم، ۱۹۵۴ء، صفحہ ۴۰)۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے پہلے مجموعہ کلام بانگ درا میں ایک نظم ”نالہ طائر بام“ کے عنوان سے درج ہے۔ یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان کسی وقت ”طلبہ علی گڑھ کالج کے نام“ لکھی تھی۔ اس نظم کا آخری شعر یہ تھا:

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا ابھی
مطلب یہ کہ انگریزوں سے سیاسی چھیڑ چھاڑ ابھی نہ کرو۔ کیوں کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد جو ضروری صلاحیت درکار ہے وہ ابھی لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی۔

انگریزوں کے ہندوستان میں داخلہ کے بعد جب رہنماؤں کے ایک بڑے طبقہ میں ان کے خلاف سیاسی جہاد کا جذبہ ابھرا تو اسی کے ساتھ اہل فکر کی ایک تعداد ایسی بھی موجود تھی جو اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انگریزوں سے سیاسی جہاد ابھی قبل از وقت اور مضر ہے۔ ہم کو پہلے اپنے آپ کو مستحکم بنانا چاہئے۔ کیوں کہ اپنی موجودہ حالت کے ساتھ ہم زمانہ جدید کے سیلاب کے مقابلہ میں ٹھہرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس سلسلہ میں یہاں دو رہنماؤں کے اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔ ایک اقبال کا۔ دوسرے رشید رضا کا۔

ڈاکٹر اقبال نے رسالہ محزن (اکتوبر ۱۹۰۳ء، مارچ ۱۹۰۵ء) میں دو قسطوں میں ایک مضمون شائع کر دیا تھا۔ اس مضمون کا خلاصہ خود اقبال کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

”اگر ہمیں اقوام عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا ضروری ہے تو اپنی نسلوں کی بہبودی کو بھی ایک موجودہ واقعہ تصور کرنا ہوگا۔ ایک زمانہ تھا جب کہ اقوام دنیا کی باہمی معرکہ آرائیوں کا فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا تھا۔ مگر آج زندگی کا دار و مدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔“

مسلمانوں نے بالعموم یہ سمجھا ہے کہ تعلیم کا مقصد زیادہ تر دماغی تربیت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں میں ایسی قابلیت پیدا کرنا ہے جس سے ان میں باحسن وجہ اپنے تمدنی فرائض ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جن قوموں نے تعلیم کے اس راز کو سمجھا وہ آج ترقی کے آسمان پر ہیں۔

پارسیوں کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک زمانہ میں وہ عظیم الشان قوم تھی۔ کیانی ہندیب و مدن، شہنشاہ یزدجرد کے عہد میں عربی سواروں نے ختم کر دیا۔ مگر کیا یہ قوم صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قوم نے انقلاب کے اس مہموم کو سمجھ لیا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت صنعت و تجارت ہے۔ تجارت کا ایک کثیر حصہ ان کے ہاتھوں میں ہے اور یہی وجہ ان کے سنبھل جانے کی ہے۔

ان اعتبارات سے مسلمانوں کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بد قسمت قوم حکومت کھو بیٹھی، صنعت کھو بیٹھی، تجارت کھو بیٹھی۔ اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور اخلاس کی تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا جیکے کھڑی ہے۔ حتیٰ کہ ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام لوگوں کو جہنم کا ایندھن قرار دے دیتا ہے ۛ

علامہ رشید رضا مصری ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی دعوت پر ہندستان آئے تھے اس کے سالانہ اجلاس سے فارغ ہو کر وہ دارالعلوم دیوبند گئے۔ وہاں انھوں نے ایک تقریر کی جس کے ایک حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

”اشاعت اسلام کے دو طریقے ہیں۔ ایک، اسلام کے احکام و ہدایات کا عام مسلمانوں تک پہنچانا، اسلام کی اشاعت کا دوسرا حصہ کافروں اور بت پرستوں سے متعلق ہونا چاہئے۔ ہندستان میں صد با قسم کے بت پرست ہیں۔ یہاں بتوں کو پوجنے والے، درختوں اور پتھروں کو پوجنے والے، چاند، سورج، ستاروں اور نہایت لغویات اور خرافات کو پوجنے والے بھی موجود ہیں۔ پس اگر دعا و تبلیغ کی ایک مضبوط جماعت موجود ہو تو ان لوگوں میں اسلام کی اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہو سکتی ہے جو اس وقت ہمارے خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔ یہ عیسائیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے۔“

اس کے علاوہ ایک خاص بات اور ہے جو ہر ایک دور اندیش مسلمان کی توجہ کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلہ میں اس قدر کم ہے کہ ان کی ہستی کو اس ملک میں ہمیشہ معرض خطر میں سمجھنا چاہئے۔ انگریزی حکومت نے جو کہ عقل اور عدل کی حکومت ہے، غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان موازنہ قائم کر رکھا ہے۔ اگر خدا نخواستہ یہ موازنہ کسی وقت ٹوٹ جائے تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ کیا نتیجہ ہو گا۔ غالباً مسلمانوں کا وہی حشر ہو گا جو اندلس میں ہوا تھا۔ اس لئے ایک جماعت ہم میں ایسی ہونی چاہئے جو ان شبہات کو رفع کرے جو اسلام پر عامہ کئے جاتے ہیں۔ یہ شبہات جو موجودہ زمانہ کے علوم و فنون کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں، ان کا دور کرنا بہت ضروری ہے، گراں شبہات کو رفع کرنا بغیر فلسفہ جدید کی واقفیت کے ناممکن ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اشخاص فلسفہ جدید

کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں۔“ روادار العلوم دیوبند ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء)

اوپر کے دونوں اقتباسات موجودہ صدی کے آغاز سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ایسے مفکرین موجود تھے جنہوں نے مسلمانوں کو وقت کی دو اہم ضرورتوں کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے بتایا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو چیز طاقت و رہنمائی کی وہ جنگ و جدال نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ مسلمان ایک نیا اقتصادی قوتوں پر قبضہ کریں۔ دوسری طرف اسلام کی توسیع و اشاعت کے لئے خاموش جدوجہد کریں۔ یہ دونوں کام اسی حالت میں ہو سکتے تھے جب کہ مسلمان سیاسی اور غیر سیاسی جھگڑوں سے بچ کر خالص تعمیری انداز میں ان کے لئے مصروف ہوتے۔ مگر جھگڑے کی سیاست میں ہماری برہمی ہوئی دل چسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کو اس قسم کے خاموش تعمیری کام کی طرف رغبت ہی نہ ہو سکی۔ ہم نے کام کی پوری ایک بہترین صدی صرف بے معنی قسم کی سیاست میں گزار دی۔ اور اب جب کہ ہم اپنی اس غفلت کی وجہ سے دوسرے انسانی قاذلوں سے پچھڑ گئے ہیں، ہم نے اپنے لئے ایک اور مشغلہ تلاش کر لیا ہے: اپنے پیچھے پین کا الزام دوسروں کو دے کر ان کے خلاف فریاد و احتجاج کرنا۔ ہم کو آج بھی نہ اپنی غلطی کا احساس ہے اور نہ دوبارہ اپنی غلطی کی تلافی کرنے کا۔

دوسروں سے پہلے اپنے کو جاننے کی ضرورت

اگست ۱۹۷۱ء میں راقم الحروف کو احمد آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک کارخانہ دار اپنا کارخانہ دکھانے کے لئے لے گئے۔ یہ ایک نوجوان تھے۔ انہوں نے انجینئرنگ کی ڈگری لی تھی اور اب اپنے والد کے قائم کئے ہوئے کارخانہ کو سنبھالنے اور اس کو ترقی دینے میں لگے ہوئے تھے۔

”اپنی تو (Limitations) آجاتی ہیں مینجمنٹ سائنڈ پر“ انہوں نے کہا ”میں ایک انجینیر ہوں۔ مگر مینس مینجمنٹ موجودہ زمانہ میں ایک مستقل سبکدوش ہو چکا ہے۔ انجینئرنگ میں اپنی واقفیت کے باوجود مینجمنٹ کے معاملہ میں میں اپنے کو معذور پاتا ہوں۔ مجھے ایک ٹرینڈ مینجر کی تلاش ہے جو انتظامی معاملات میں میرا مددگار بن سکے۔“ اپنے دینیوی کاروبار میں لوگ اپنی محدودیت کو خوب جانتے ہیں۔ کوئی یہ غلطی نہیں کرتا کہ کام کے جس شعبہ سے وہ واقف نہیں ہے، اس میں کود پڑے اور بالآخر نقصان اٹھائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ملت کی رہنمائی کے میدان میں کوئی اس اصول کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہر آدمی جو کچھ تقریر کرنا جانتا ہو، فوراً قیادت کے اسٹیج پر ظاہر ہو کر غایت قوم کا کریڈٹ لینا شروع کر دیتا ہے۔ خواہ اس کی قیادت عملاً قوم کو بربادی کے گڑھے میں گرانے کے ہم معنی کیوں نہ بن جائے۔ حتیٰ کہ یہ نتائج اگر اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں تب بھی اس کے جوش قیادت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ نئے نئے الفاظ بول کر دوبارہ قوم کے کندھے پر سوار ہو جاتا ہے۔ موت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اس کو اعتراف شکست پر مجبور کر سکے۔



دیکھئے کہ آپ کون سا درخت اگا رہے ہیں

اس کے برعکس جو لوگ گہری جڑوں اور دور رس منصوبوں پر اپنی قومی تعمیر کریں گے، ان کو مضبوط درختوں کی سی پائیداری حاصل ہوگی، جس کو کوئی اکھاڑ نہیں سکتا اور جو صدیوں تک انسانیت کو اپنا سایہ اور پھل دیتے رہتے ہیں۔

(ایلاہیم: ۲۷-۲۴)

اگر آپ دنیا میں کوئی حقیقی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے حقیقی بنیادوں پر اپنی تعمیر کی منصوبہ بندی کیجئے۔ اس صحیح مقام کو دریافت کیجئے جہاں سے صحیح اور پائیدار جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اپنے آغاز کو پایا تو آپ اپنے اختتام کو بھی پالیں گے، کیونکہ صحیح آغاز ہی کا دوسرا نام صحیح اختتام ہے۔

دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ نے محکم قوانین کے تحت بنایا ہے اور اس کا فیصلہ ہے کہ وہ ان قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی قبول نہیں کرے گا۔ (فاطر ۴۳)

انہیں قوانین الہی میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس نے مقرر کر دیا ہے کہ جو لوگ سطحی نعروں اور جذباتی تقریر پر اپنی قوم کو اٹھائیں گے، ان کی قومی زندگی برساتی جھاڑ جھنڈا کی طرح ہوگی۔ وقتی طور پر تو وہ بہت نمایاں دکھائی دیں گے۔ مگر ان کے اندر کوئی پائیداری نہیں ہوگی۔ فاتحانہ نعروں پر اٹھتے والے لوگوں کے حصہ میں بالآخر صرف یہ فریاد آئے گی کہ ”فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ دیا ہے۔“

فضائی جاسوسی میں جو ہوائی جہاز استعمال ہوتے ہیں ان میں بہت نازک قسم کے کیمرے لگے رہتے ہیں۔ انتہائی بلندی پر اڑان کرنے کے باوجود ان کی تصویریں اتنی مکمل ہوتی ہیں کہ آدمی کے چہرے پر جذبات کا اتنا چڑھاؤ تک دیکھا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ آواز سے تیز رفتار ہوائی جہاز عموماً دشمن کا نشانہ بننے سے بچ جاتے ہیں، اپنی آواز سے آگے پرواز کرنے کی وجہ سے ان کا پتہ زمین پر کھڑے ہوئے لوگوں کو اس وقت ملتا ہے جبکہ ہوائی جہاز ان کے اوپر سے گزر کر بہت دور پہنچ گیا ہو۔ گویا زندگی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ اپنا سفر اس طرح طے کریں کہ آپ کا حریف آپ کی کارگزاریوں سے صرف اس وقت واقف ہو جب کہ آپ اپنا کام پورا کر چکے ہوں۔

کبھی شکست بھی

فتح ثابت ہوتی ہے

زندگی کے حقائق اس سے کہیں زیادہ
وسیع ہیں کہ وہ فتح و شکست
کی اصطلاحوں میں سما سکیں۔

اسلام کی قدیم تاریخ میں اغیار کی طرف سے
اس کو دو بڑے فوجی مقابلے پیش آئے ہیں۔ ایک تاتاریوں
سے، دوسرے مسیحیوں سے۔ تاتاریوں سے مقابلہ بارہویں صدی
کے آخر میں پیش آیا۔ مسلم قوموں کو اس مقابلہ میں ٹکلی شکست
ہوئی۔ مگر اس شکست کے اندر سے حیرت انگیز طور پر ایک
نیا امکان برآمد ہو گیا۔ فتح نے تاتاریوں کے انتقامی جذبہ
کو ختم کر دیا۔ اب وہ نفسیاتی طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ
منفوج کے مذہب و عقائد پر یہ آمیز رائے قائم کر سکیں۔ انہیں
نظر آ رہا کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور اس میں خود ان کی اپنی
بھلائی چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی شکست پر ایک
صدی بھی نہیں گزری تھی کہ تاتاری حکمران مسلمان ہو گئے اور
سارا مسئلہ ایک نئی بہتر شکل میں ختم ہو گیا۔ فوجی
میدان کے فاتح فطرت اور نفسیات کے میدان میں اپنے
منفوجوں سے شکست کھا گئے۔

مسیحی یورپ اور مسلمانوں کے درمیان مقابلہ اس
کے برعکس مثال پیش کرتا ہے۔ مسیحی یورپ سے دو سو سالہ
صلیبی لڑائی کے بعد مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی
اور مسیحی اقوام کو بدترین شکست کے بعد واپس لوٹنا پڑا۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ سارے یورپ میں اپنے
غالب حریف کے خلاف انتقام کی ایک نہ ختم ہونے والی
آگ بھڑک اٹھی۔ اپنے تمام وسائل کو انہوں نے ایک نئے

مقابلہ کی تیاری کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ ان کی یہ
مخالفانہ کوششیں پانچ صدیوں تک جاری رہیں۔ یہاں تک
کہ ان کی کامیابی اس انتہا کو پہنچی کہ انہوں نے قوت و طاقت
کے نئے میدان دریافت کر لئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو زندگی
کے ہر شعبے میں شکست دے کر ساری دنیا پر اپنی سیادت کا
بھندہ لگا کر دیا۔ انہوں نے قدیم طرز کی ملاحی جہاز
رائی کو ترقی دے کر دفاعی جہاز رائی کے مقام پر پہنچایا اور
اس کے زور پر تمام سمندروں پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے
دور مار ہتھیار تیار کر کے مسلم ملکوں کو کند کر دیا۔ انہوں
نے مشینی صنعت ایجاد کر کے مسلم دستکاری کا خاتمہ کر دیا۔
انہوں نے سائنسی علوم وضع کر کے مسلمانوں کے روایتی علوم
کو بے قیمت کر دیا۔ انہوں نے محکمی کی ایک نئی قسم (اقتصادی
اور فنی محکمی) مدعو کر کے تمام مسلم دنیا کو مجبور کیا کہ سیاسی
طور پر آزاد ہونے کے بعد بھی وہ انہیں کی غلام اور محکوم
بنی رہے۔

پچھلی آٹھ سو سالہ تاریخ کا یہ تجربہ بتاتا ہے کہ وہ
لوگ سخت غلطی پر ہیں جو صرف فتح و شکست کی اصطلاحوں
میں سوچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے حقائق اس
سے کہیں زیادہ وسیع ہیں کہ فتح و شکست کی اصطلاحوں
میں سما سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح کبھی شکست
ثابت ہوتی ہے اور شکست بھی کسی وقت فتح بن جاتی ہے۔

اسلام کا طریقہ حقیقت پسندی کا طریقہ ہے

نہ کہ حالات کا اندازہ کئے بغیر چھلانگ لگانے کا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُذِنَ لِلَّهِ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَقَدْ أُذِنَ

ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس لئے کہ ان پر ظلم ہوا اور بلاشبہ اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

مکہ کے مشرک مسلمانوں کو بہت تکلیفیں دیتے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو کسی کا سر پھٹا ہوتا، کوئی زخمی ہوتا، کوئی چوٹ کھایا ہوا ہوتا۔ وہ آپ سے شکایتیں کرتے۔ مگر آپ کا جواب صرف یہ ہوتا: صبر کرو مجھے ابھی لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے (اصبروا فانی لدو امر بالقتال، تفسیر النسفی)۔ اسی حال میں تیرہ برس گزر گئے۔ پھر ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں قتال کی ہدایات بھی گئیں۔ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم، ابن مردودہ اور بیہقی نے دلائل میں عبد اللہ بن عباس کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ کچھ اوپر ستر آیات میں قتال کی ممانعت کے بعد اجازت کی یہ پہلی آیت قرآن میں نازل ہوئی (یہی اول آیت اُذِنَ فیہا بالقتال بعد ما نھی عندہ فی نینف و سبعین آیت)

یہاں یہ سوال ہے کہ مسلمانوں پر ظلم تو کی دور میں اپنی بدترین شکل میں ہو رہا تھا، اور اللہ بلاشبہ اس دفت بھی مسلمانوں کی نصرت پر پوری طرح قادر تھا۔ پھر مکہ میں "قتال" کی اجازت کیوں نہ دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق مسلمان ابھی اتنے طاقتور نہ ہوئے تھے کہ ان کا کوئی اقدام فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچ سکتا۔ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کی طاقت اس معیار کو پہنچ گئی کہ ان کا اقدام یوم الفرقان (انفال - ۳۱) کو وجود میں لانے کے ہم معنی بن سکے تو مذہب بھیڑ کی اجازت دے دی گئی۔

پچھلے ڈیڑھ سو برس سے اسلام کے علم بردار جس طرح اپنے مفروضہ حریفوں سے ٹکرا رہے ہیں اور نقصان ہر بار اسلام کے علم برداروں کے حصہ میں آتا ہے، وہ اس قرآنی اصول کی صریح خلاف ورزی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اقدامات محض نادانی کے اقدامات تھے، اگرچہ غلط طور پر ان کو "اسلامی جہاد" کا مقدس نام دے دیا گیا۔

مکمل تدبیر، اور اسی کے ساتھ اللہ پر مکمل اعتماد

انسان بیک وقت دو مختلف تقاضوں کے درمیان ہے۔ ایک عبدیت کا تقاضا، دوسرے امتحان کا۔ انسان کے حالات امتحان میں ہونے کا پہلو تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے سارے اختیار اور اپنی تمام امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے۔ دوسری طرف عبدیت کا پہلو زور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر حال میں آدمی اللہ پر بھروسہ رکھے، اپنے کو یا اپنی تدبیروں کو کچھ نہ سمجھے۔ اسباب کا اہتمام ہمارے حالات امتحان میں ہونے کا اظہار ہے اور اللہ پر اعتماد ہماری حالت عبدیت کا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جب مکہ کے حالات اس حد تک سخت ہو گئے کہ لوگوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کر لیا تو آپ اپنے وطن کو چھوڑ کر یثرب (مدینہ) چلے گئے۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے لئے آپ نے ہر قسم کا ممکن اہتمام فرمایا۔ سفر کے ہر جز کو مکمل طور پر راز میں رکھا۔ عام شاہراہ کے بجائے غیر معروف راستہ سے سفر فرمایا۔ مکہ سے رات کے وقت پیدل نکلے اور سواری کا انتظام آگے ایک صحرائی مقام سے کیا۔ آپ کو مدینہ جانا تھا جو مکہ سے شمال کی جانب واقع ہے۔ مگر آپ نے اس کے الٹی طرف جنوبی سمت میں سفر فرمایا۔ مکہ کے باہر چند میل جا کر ایک سسنان پہاڑی غار (ثور) میں تین دن ٹھہرے رہے جو امناتنگ تھا کہ آدمی صرف لیٹ کر اس کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ جب ابوبکر صدیق کے ساتھ غار ثور میں مقیم تھے، قریش کے کچھ لوگ آپ کو ڈھونڈتے ہوئے غار کے کنارے تک پہنچ گئے۔ آہٹ پا کر ابوبکر صدیق نے کہا، دشمن اتنے قریب آچکا ہے کہ اگر اکھنوں نے جھک کر اپنے قدموں کے نیچے کی طرف دیکھا تو وہ ہم کو پالیں گے۔ آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا:

ما ظنک باثنین یا ابابکر اللہ ثالثہما ابوبکر ان دو کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہو

اس واقعہ میں نبوت کا مقام نظر آ رہا ہے۔ ایک طرف تدبیر کمال درجہ پر۔ دوسری طرف اللہ پر اعتماد کمال درجہ پر۔ یہی نبوت کی شان ہے۔ پیغمبر اس شان عبدیت میں کمال درجہ پر ہوتا ہے۔ پیغمبر کے ساتھیوں اور رفیق پانے والوں میں بھی یہ اوصاف درجہ بدرجہ پیدا ہوتے ہیں۔

کیسی عجیب خیرامت

”مسلمان جب تک معاشی اور تعلیمی میدانوں

میں برادران وطن کے برابر نہ ہو جائیں ان کو مظلوم اور محروم طبقہ قرار دے کر ان کو پس ماندہ فرقوں کی طرح مراعات اور سہولتیں دی جائیں“۔ یہ وہ مطالبہ ہے جو پچھلے چند سالوں سے تمام مسلم جماعتوں کی طرف سے حکومت سے کیا جا رہا ہے۔ اس قسم کا مطالبہ کرنے والے لیڈر اگر فی الواقع اپنے مطالبہ میں سچے ہیں تو اس اصول کو سب سے پہلے انھیں خود اپنے درمیان جاری کرنا چاہئے۔ ہر لیڈر جو اس حال میں ہے کہ اس کے گرد و پیش (خاندان کے اندر یا باہر) کچھ لوگ اس کے مقابلہ میں معاشی حیثیت سے پچھڑے ہوئے ہیں، اس کو چاہئے کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس وقت تک ان لوگوں کے لئے وقف رکھے جب تک یہ پس ماندہ لوگ معاشی حیثیت سے اس کے برابر نہ ہو جائیں۔ اس قسم کا مطالبہ کرنے والے قائدین اگر خود اپنے درمیان اس اصول کو جاری کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو وہ کیوں کر امید رکھتے ہیں کہ اپنی ”تحریف قوم“ سے وہ اس کو منوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

عجیب بات ہے کہ اس قسم کا مطالبہ کرنے والے قائدین اسی کے ساتھ مسلمانوں کے ”خیرامت“ ہونے کا ذکر بھی زور شور کے ساتھ کرتے ہیں اور غرض کے ساتھ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمان کا منصب یہ ہے کہ وہ سارے عالم کے نظام کو درست کرے اور اس کو خیر و صلاح سے بھر دے۔ کیسی عجیب ہوٹل وہ خیرامت جس کا حال ایک طرف یہ ہو کہ اپنے کو ”مظلوم اور محروم“ طبقہ قرار دے کر دنیا والوں سے رعایتوں کی خیرات مانگ رہی ہو۔ اور اسی

کے ساتھ وہی وہ آسمانی گروہ ہو جس سے دنیا اپنی اصلاح و ترقی کی امید رکھے۔

ہماری ملی مشکلات کا سبب دراصل ہماری اپنی کوتاہیاں ہیں۔ ہم جدید اقتصادیات میں اپنی جڑیں قائم نہ کر سکے۔ ہم وقت کی تعلیم میں پیچھے ہو گئے۔ بے معنی اندرونی نزاعات نے ہم کو اتحاد سے محروم کر رکھا ہے۔ ہمارے سامنے کوئی ایسا قابل عمل مشن نہیں جس میں ہمارے افراد اپنی ذہنی اور عملی قوتوں کا نکاس پاسکیں۔ ہمارے قومی کردار کا حال یہ ہے کہ جب بھی کسی معاملہ میں ہمارے صبر، تحمل، محنت دیانت داری، خیر خواہی، انصاف، بلند جو عقلی اور وسعت قلبی کا امتحان ہو تو اصغر سے لے کر اکابر تک سب ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ یہ داخلی کمزوریاں ہی ہمارا اصل مسئلہ ہیں اور ان کی اصلاح کے لئے خاموشش جدوجہد کرنے کا نام کام ہے۔ مگر ہمارے کسی رہنما کو اس قسم کی تعمیری جدوجہد میں لگنے سے دل چسپی نہیں، البتہ طرح طرح کی بولیاں بول کر وہ لوگوں کے ذہنوں کو الجھا ہوئے ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ ہم کو حفاظت خود اختیاری کے تحت اپنا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔ کسی نے اسلام کے کچھ سیاسی قصائد یاد کر لئے ہیں اور وہ بس انھیں کو دہراتا رہتا ہے۔ کوئی جا بجا تقریری تائش گا ہیں کھڑی کرنے میں جگہ گاتا ہوا مستقبل دیکھ رہا ہے۔ کوئی شتر مرغ کی طرح خیالی پناہ گاہیں بنانے میں مصروف ہے۔ کوئی احتجاج اور مطالبات کی رٹ لگائے رکھنے کو کام سمجھتا ہے۔ مگر اس قسم کی ہر بات صرف اپنی برہادیوں کو دائمی بنانے کے ہم معنی ہے۔ یہ محض کچھ الفاظ ہیں اور جو مسئلہ عمل کی کمی سے پیدا ہوا ہو اس کو الفاظ بول کر حل نہیں کیا جاسکتا۔

ہر غروب کے لئے ایسا نیا طلوع مقدر ہے

سورج پچھم میں غروب ہوتا ہے تاکہ دوبارہ پورب سے نئی شان کے ساتھ طلوع ہو۔ یہ ایک روشن نشانی ہے جو آسمان پر ظاہر ہو کر ہر روز ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی مملکت کا نظام کس طرح بنایا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ایک کائناتی اعلان ہے کہ خدا کی اس دنیا میں کوئی ”غروب“ آخری نہیں۔ ہر غروب کے لئے ایک نیا طلوع مقدر ہے۔ بشرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر حوصلہ ہو۔ غروب کا واقعہ پیش آنے کے بعد وہ از سر نو اپنی جدوجہد کا منصوبہ بنائے۔ زندگی کی شاہ راہ پر دوبارہ اپنا سفر شروع کر دے۔

ناکامی کے اسباب ہمیشہ آدمی کے اپنے اندر ہوتے ہیں
مگر اکثر وہ ان کو دوسروں کے اندر تلاش کرنے لگتا ہے

زندگی کا راز

ایڈجسٹمنٹ میں ہے

نہ کہ

مقابلہ آرائی میں

مثال پیش کرتا ہے۔ ہماری زبان میں اختلاف اور ٹکراؤ کے مفہوم کو بتانے کے لئے درجنوں الفاظ ہیں۔ مگر ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ نہیں۔

پچھلے دو سو برس سے ہندوستانی مسلمانوں پر احتجاج اور ٹکراؤ کی سیاست اتنی زیادہ چھوٹی رہی ہے کہ اردو زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ ہی نہ بن سکا جس کے انگریزی میں ADJUSTMENT کہا جاتا ہے۔ ”بازمانہ ستیز“ کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں درجنوں الفاظ ہیں۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ ADJUSTMENT کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے ہمارے یہاں کوئی ایک لفظ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان آج سب سے زیادہ لڑنے جھگڑنے والی قوم بن گئے ہیں۔ حالات سے ہم آہنگی کرتے ہوئے اپنا راستہ نکالنا جیسے ان کو آنا ہی نہیں۔ ان کی جگہ جو یا نہ تحریکوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انھیں خبر ہی نہیں کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ مقابلہ آرائی میں۔

اس صورت حال کے نتیجہ میں ایک عجیب مشکل یہ پیدا ہوئی ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اگر یہ کہتا ہے کہ ثنی مقاصد کے حصول کے لئے جو منصوبہ بناؤ، حالات سے ہم آہنگ ہو کر بناؤ تو یہ بات ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ اس قسم کی آواز حقیقتہً ایڈجسٹمنٹ کی آواز ہوتی ہے مگر سننے والے اس کو ”چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی“ کے ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ کیوں کہ جن الفاظ سے وہ مانوس ہیں انھوں نے ان کو دوہی مفہوم سے آشنا کیا ہے: زمانہ سے لڑنا یا ہوا کے رخ پر چلنا۔ ان دو کے علاوہ کسی تیسرے رویہ کو وہ جانتے ہی نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جاپانی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو ”کام“ کے مفہوم کو بتاتے ہیں۔ مگر ابھی حال تک جاپانی زبان میں ایسا کوئی لفظ نہ تھا جو ”فرحت“ کے مفہوم کو ادا کرتا ہو۔ غالباً یہ واحد عامل ہے جس نے جاپانی قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ محنتی قوم بنا دیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی اقتصادیات بالکل برباد ہو گئی تھیں۔ مگر جاپانی محنت نے معجزہ دکھایا۔ جنگ کے صرف ۲۵ سال بعد جاپان نے اقتصادی حیثیت سے دنیا کے چند انتہائی ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں جگہ حاصل کر لی۔ مسلمانوں کا معاملہ ایک اور پہلو سے دل چسپ

Japanese did not have 'leisure'

There are plenty of words in the Japanese language meaning "work" but till recently it had no word for "leisure". This may be the one single factor to explain how Japan has emerged as a major economic power within the past two decades, says a report in The Times, London.

The Times of India, 9.11.1975

سب سے زیادہ

معلوم بات

جس کو لوگ سب سے زیادہ کم

جانتے ہیں

ہر مسافر جانتا ہے کہ ایک ٹرین چھوٹ جائے تو جلد ہی بعد
دوسری ٹرین مل جاتی ہے جس سے وہ اپنا سفر
جاری رکھ سکے۔

یہ پلیٹ فارم کا سبق ہے۔ مگر اکثر لوگ اس معلوم سبق
کو اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ زندگی کی دوڑ
میں ایک موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔

اپنی غلطی کی قیمت آدمی کو خود ادا کرنی پڑتی ہے۔ مگر

آدمی غلطی کرنے کے بعد ہمیشہ کسی دوسرے کو تلاش کرنے لگتا ہے

جو اس کی طرف سے اس کی غلطی کی قیمت ادا کر دے۔

نے محمد علی سے پوچھا کہ یون اسپنکس سے مقابلہ میں مجھوں
کے فیصلہ کو کیا وہ صحیح فیصلہ سمجھتے ہیں۔ محمد علی نے صاف
لفظوں میں کہا:

It was a fair decision.

یہ ایک بے لاگ فیصلہ تھا۔ علی نے صاف لفظوں میں اپنی
شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

I misjudged the man (Spinks)
and fought a wrong battle. my
planning was not correct be-
cause I did not know much
about Spinks

The Times of India, 23.2.1978

میں نے اپنے حریف کو سمجھنے میں غلطی کی اور اس سے غلط
جنگ لڑی۔ میری منصوبہ بندی صحیح نہیں تھی کیوں کہ میں
اسپنکس کے بارے میں کچھ زیادہ جانتا نہ تھا۔

محمد علی نے اب اپنی زندگی کا نیا نظام بنایا اور
باقاعدہ تیاری میں لگ گئے۔ وہ دن بھر دوڑتے ،
پہاڑیوں پر چڑھتے۔ بھری ہوئی بوری میں گھونسے مارا کر
اپنے ہاتھوں کی تربیت کرتے۔ اپنے ساتھیوں سے آزمائش
مقابلے کرتے ، اور اسی کے ساتھ عبادت کر کے دعا بھی
کرتے کہ خدا انھیں اگلے مقابلہ میں کامیاب کرے۔
محمد علی کی عمر ۳۶ سال ہے اور ان کے حریف یون اسپنکس
کی عمر ۲۵ سال ، یعنی دونوں کی عمر میں گیارہ سال کا
فرق ہے۔ مبصرین کا خیال تھا کہ محمد علی کی عمر ان کے لئے
فیصلہ کن بن چکی ہے اور اب وہ اپنے نوجوان حریف
سے دوبارہ جیت نہیں سکتے۔ مگر محمد علی نے پورے جوش
اور اہتمام کے ساتھ اپنی تیاریاں جاری رکھیں۔ وہ روزانہ
صبح ۵ بجے اٹھ کر تین میل پہاڑی راستہ پر دوڑتے جب کہ
ابھی اندھیرا چھایا ہوا ہوتا اور لوگ اپنے نرم بستروں پر
سوئے ہوئے ہوتے۔ اس کے بعد سارے دن سخت ترین

جو شخص ہار کو مان لے وہی

تیاری کر کے دوبارہ اپنے حریف

کے مقابلہ میں کامیاب ہوتا ہے

۱۵ فروری ۱۹۷۸ء کو ساری دنیا نے حیرت کے

ساتھ یہ خبر سنی کہ باکسنگ کے مشہور چیمپین محمد علی کو ایک
غیر معروف کھلاڑی یون اسپنکس نے ہرا دیا۔ اب محمد علی
کے لئے ایک راستہ وہ تھا جو عام طور پر ہارے ہوئے سیاستدان
اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک اخبار نکال کر مجھوں کی ”دھاندلی“
کا شور مچاتے۔ اپنے پر جوش حامیوں کو لے کر اسپنکس کے
خلاف انجی ٹیشن چلاتے اور اس کو قتل کرنے یا اس پر مقدمہ
چلانے کی کوششیں کرتے۔ خود ساختہ طور پر ایک لقب
وضع کر کے اپنے نام کے ساتھ لگا لیتے اور سمجھتے کہ وہ اب
بھی کھیل کی دنیا کے ”امام“ ہیں۔ محمد علی اگر اس قسم کا
راستہ اختیار کرتے تو اس کے لئے ان کے پاس پیسہ بھی تھا
اور اعوان و انصار بھی۔ مگر اس قسم کے تمام طریقوں کو
چھوڑ کر انھوں نے محنت و مشقت اور خاموش تیاری کا
طریقہ اختیار کیا۔

ہارنے کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ،
محمد علی نے فروری ۱۹۷۸ء کے تیسرے ہفتہ میں بنگلہ دیش
کا پانچ روزہ دورہ کیا۔ ان کو بنگلہ دیش کی اعزازی شہریت
دی گئی اور ان کو امریکہ میں بنگلہ دیش کا اعزازی قونصل
جسٹ بنانے کا اعلان کیا گیا۔ اس موقع پر ۲۲ فروری کو
ڈھاکہ کی ایک پریس کانفرنس میں ایک اخباری نمائندہ

حتیٰ کہ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں پولس نے اس کا چالان کیا۔ جب کہ محمد علی برابرائی تیارپا میں مشغول رہا۔

ہارکو مان لینا اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ یہ حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ یہ جھوٹ کو چھوڑ کر سچائی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ جو شخص اپنی ہار مان لیتا ہے، اس کے اندر حقیقت پسندانہ نفسیات ابھرتی ہیں۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ حالات کا جائزہ لیتے لگتا ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو سمجھ کر دوبارہ اپنی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ حریف کے خلاف لفظی طوفان اٹھانے کے بجائے حقیقی میدان میں اس کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتا ہے۔ ایک طرف اس کا حریف فتح کی خوشی میں مگن ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ اپنی شکست کے احساس کو لئے ہوئے سنجیدہ تیاریوں میں مصروف ہوتا ہے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص مقابلہ کے میدان میں ہار گیا تھا وہ دوبارہ اپنے حریف کو شکست دے کر کامیاب ہو جاتا ہے۔

قسم کی ورزشوں میں لگے رہتے۔ اگست میں، مقابلہ کی تاریخ سے کچھ پہلے، انھوں نے ڈیریک (فیلو انیا) میں اپنے کھیل کا مظاہرہ کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ ۱۵ ستمبر کے مقابلہ میں میں دوبارہ ٹائٹل جیت لوں گا۔ اخباری رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ۳۶ سالہ علی آج کل اپنے بانگ سٹریٹز پر دست تیری میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ بے غمخیزہ ہو گئے ہیں۔ اخباری رپورٹ کا ایک جملہ یہ تھا۔

Members of the Ali entourage insist that they have never seen Ali work so hard.
The Times of India 17.8.78

محمد علی کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے محمد علی کو اتنا سخت محنت کرتے ہوئے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس طرح محنت اور تیاری کے چھ سخت مہینے گزارنے کے بعد محمد علی نے ۱۶ ستمبر ۱۹۷۷ کو دوبارہ یون اسپنکس سے مقابلہ کیا اور اس کے ادریشان دار فتح حاصل کی۔ اسپنکس فتح کے بعد عیاشیوں میں بڑگیا

مکان نیچے سے اٹھایا جاتا ہے نہ کہ اوپر سے

زمین کو انسان کی قیام گاہ بنایا گیا ہے۔ مگر وہی قیام گاہ زمین کے اوپر کھڑی ہوتی ہے جس کی تعمیر کو بنیاد سے شروع کر کے چھت تک پہنچایا گیا ہو۔ کوئی شخص چھت کی طرف سے اپنا مکان بنانا شروع کر دے تو خدا کی زمین ایسے مکان کو قبول کرنے سے انکار کر دے گی۔

یہ اس دنیا کی ایک اہل حقیقت ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ جب ملت کی تعمیر کا سوال آتا ہے تو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ وہ چھت کی طرف سے ملت کا عمل اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ خواہ ان کا عمل بالآخر زمین بوس ہو کر مایوسی اور بے یقینی کے ملبہ کے سوا ان کے لیے کچھ اور نہ چھوڑے۔

ناموافق حالات زندہ قوموں کیلئے ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں

آرنلڈ ٹائٹن بی (۱۹۷۵-۱۸۸۹) چند خوش قسمت مصنفین میں سے ہے جس نے اپنی زندگی ہی میں عالمی مقام حاصل کر لیا۔ اس انگریز مورخ کو سب سے زیادہ شہرت اپنی ۱۰ جلدوں پر مشتمل ”اسٹڈی آف ہٹری“ کی وجہ سے ملی جس میں اس نے ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیلئے۔ اس کتاب کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ وہ قوتیں جو تاریخ بناتی ہیں، وہ بنیادی طور پر داخلی قوتیں ہیں نہ کہ خارجی اسباب۔ اس نے قدیم زمانہ سے لے کر اب تک تمام بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کر کے دکھایا ہے کہ ان تہذیبوں کو جن قوموں نے پیدا کیا، وہ تخلیقی صلاحیت رکھنے والی اقلیتیں تھیں جنہوں نے وقت کے چیلنج کا کامیابی کے ساتھ جواب دیا۔

اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ وہ اکثریت کی طرف سے مسلسل دباؤ میں رہتی ہیں۔ یہ دباؤ عملی زندگی میں بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی وجہ سے کسی قوم کی وہ اندرونی تخلیقی صلاحیت ابھرتی ہے جو اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ پیش آنے والے چیلنج کے مقابلہ میں قائدانہ رول ادا کر سکے۔ اس کے برعکس جن قوموں کی لغت میں ”دباؤ“ کے معنی صرف ”مظلومیت“ کے ہوتے ہیں، ان کے حصہ میں فریاد و احتجاج کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ اپنی محرومیوں کا رجسٹر بنانے میں مشغول رہتی ہیں یا جلسوں اور تقریروں کا کمال دکھا کر سمجھتی ہیں کہ انہوں نے اپنی سر بلندی کا راز پایا ہے۔ یہاں تک کہ جب وقت کا قافلہ آگے بڑھ جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے اس دنیا میں قبرستان کے سوا اور کچھ نہیں۔

جھگڑے سے ہٹ کر اپنی تعمیر کیجئے

بے وقوف کسان نے مینڈکے جھگڑے کو مینڈ پر طے کرنے کی کوشش کی۔
جس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ بے شمار نئے نئے جھگڑے کھڑے ہو گئے۔ اور
پہلا جھگڑا بھی طے نہ ہوا۔

عقل مند کسان کو اپنے پڑوسی سے مینڈ کا جھگڑا پیش آیا تو اس نے مینڈ کو
چھوڑ دیا۔ وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ اپنے بقیہ کھیتوں اور باغوں کو
ترقی دے۔ اس طریق کار کا شاندار نتیجہ برآمد ہوا۔ بالآخر اس نے نہ صرف
اپنی کھوئی ہوئی مینڈ حاصل کر لی بلکہ اس قابل ہو گیا کہ پہلے سے بھی
زیادہ بڑی جائیداد اپنے لئے خرید لے۔



ناکافی تیاری کے ساتھ کیا ہوا اقدام مسئلہ کو پہلے سے زیادہ سنگین بنا دیتا ہے

شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان خور نہیں ہوتا۔ کسی شیر کو انسان خور بنانے والے اکثر وہ غیر ماہر شکاری
ہوتے ہیں جو شیر پر گولی چلاتے ہیں مگر ان کی گولی صحیح نشانہ پر پڑنے کے بجائے اچلتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ اس
قسم کا شیر انسان دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں کہیں انسانی شکل کو دیکھتا ہے، اس پر حملہ کر کے اسے کھا جاتا ہے۔
اسی طرح اگر آپ اپنے حریف پر ایسے اقدامات کریں جو ناکافی تیاری کی وجہ سے فیصلہ کن نہ بن سکیں تو اس قسم کا
ہر اقدام آپ کے حریف کو پہلے سے زیادہ مشتعل کر کے آپ کے مسئلہ کو اور زیادہ سنگین بنا دے گا۔

لڑائی بھڑائی کا نام سیاست نہیں

ابو فراس حمدانی عباسی دور کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

إِذَا مَا أَرْسَلَ الْأُمَرَاءُ جَيْشًا

إِلَى الْأَعْدَاءِ أَرْسَلْنَا الْكِتَابَا

یعنی ہماری دھماک کا یہ عالم ہے کہ جہاں دوسرے امراء کو مقابلہ کرنے کے لئے لشکر بھیجنا پڑتا ہے وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں اور وہی فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

شاعر نے ایک شعر میں سیاست کا راز بتا دیا ہے۔ سیاست یہ نہیں ہے کہ حریف سے براہ راست لڑائی چھیڑ دی جائے۔ سیاست یہ ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور اور مستحکم بنایا جائے کہ جب ضرورت پڑے تو ایک تحریری دامنک بھیج دینا معاملہ کو ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔

آپ لکڑی کو توڑیں تو وہ دو ٹکڑے ہو جائے گی

مگر زندہ چینروں کے لئے شکست کا کوئی

سوال نہیں۔ ایک زندہ ایبیا (AMOEBIA) جب

ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ ایبیا بن جاتا ہے۔

کام صرف وہ ہے جو خود اپنے مثبت فکر کے زور پر وجود میں آئے۔

خارجی حالات کے خلاف رد عمل کے طور پر جو چیز ظاہر ہو، وہ کام

نہیں، جذباتی ابال ہے۔ اس قسم کا جذباتی ابال وقتی شور و شر

تو ضرور پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اس سے کسی حقیقی نتیجہ کی امید کرنا ایسا ہی

ہے جیسے کتے کی بھونک سے بلبیل کے نغمہ کی توقع کی جائے۔

نادانی کی چھلانگ

لیمپ جل رہا تھا۔ ایک پتنگا کہیں سے کمرے میں داخل ہو گیا اور لیمپ کے گرد منڈلانے لگا۔ کتا دیر تک یہ منظر دیکھتا رہا۔ آخر اس کو گوارا نہ ہوا کہ اس کے آقا کی میز پر ایک پتنگا قابض ہو جائے۔ اس نے اس کو پکڑنے کے لئے ایک چھلانگ لگائی۔ پتنگا تو اڑ گیا، البتہ لیمپ الٹ گیا اور میز پر تیل پھیل جانے کی وجہ سے فوراً آگ لگ گئی اور کاغذات جل گئے۔ اڈین نے دیکھا تو کہا:

”میرے محبوب کتے! تجھے نہیں معلوم کہ تو نے کیا کیا۔“
موجودہ زمانے میں ہمارے رہنماؤں نے بھی حیرت انگیز طور پر اسی قسم کے کارنامے دکھائے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اصلاح ملت اور اچھائے اسلام کا نعرہ لے کر اٹھا۔ مگر ہر ایک نے ایسی نادانی کی چھلانگیں لگائیں کہ اصل مقصد تو حاصل نہیں ہوا البتہ نئے نئے مسائل اور نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جس کے نتیجہ میں مسئلہ پہلے سے بھی زیادہ گنجھیر ہو گیا۔ نادانی کے اقدام سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ کوئی اقدام ہی نہ کیا جائے۔

حکایت ہے کہ کسی زمانہ میں بہت بڑا سیلاب آیا۔ ایک بندر اور ایک مچھلی اس میں پھنس گئے۔ بندر تیز تھا۔ چھلانگ لگا کر ایک درخت پر چڑھ گیا اور ایک شاخ پر جا بیٹھا جہاں وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ تھا۔ اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو دیکھا کہ مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس نے سمجھا کہ مچھلی طوفان میں پھنس گئی ہے۔ وہ پوری مہمردی اور نیک نیتی کے ساتھ نیچے آیا اور مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا۔ اس کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے۔

نادان دوستی کی تمثیل ایڈین کی زندگی میں واقعہ بن چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایڈین ایک کتا پالے ہوئے تھا جو اس کو بہت محبوب تھا۔ ایک روز ایڈین کا کتا اس کے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میز پر اس کے ضروری کاغذات پھیلے ہوئے تھے اور کروسین کا

حقیقت پسند بننے

خدا نے اپنی دنیا کا نظام انتہائی محکم بنیادوں پر بنایا ہے۔ کوئی درخت کبھی
طلسماتی طور پر نہیں اگتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک آسمانی کردہ چھلانگ
لگا کر اچانک اس سرے سے اس سرے پر پہنچ جائے۔

ایک ایسی دنیا میں ہم ایسے ”بزرگ“ کی پیدائش کا انتظار کر رہے ہیں جو کراماتی
طور پر واقعات کو ظہور میں لائے۔ ہم ایسے ”قائد“ کی تلاش میں ہیں جو ایک
بڑا سا مظاہرہ کر کے آنا فانا قوم کے لئے نیا مستقبل پیدا کر دے۔

جو لوگ اس قسم کی امیدوں پر جی رہے ہیں انھیں جاننا چاہئے کہ خدا کی
اس دنیا میں ایسے طلسماتی واقعات کا ظہور ممکن نہیں۔ اگر انھیں طلسمات
ہی کے ہمارے زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی پسند کے مطابق دوسری کائنات
بنانی پڑے گی

”سادھارن گنوں سے اسادھارن منشاء بنتے ہیں“ یہ ہندی کی ایک سوکتی ہے
عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بڑا انسان بننے کے لئے کوئی بڑا واقعہ چاہئے جو اس کو اخبار
کی شاہ سرخی میں جگہ دے سکے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اکثر معمولی باتوں میں غیر معمولی انسان
بننے کا راز چھپا ہوتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں

لفظی تسکین کی قیمت

بہت مہنگی دینی پڑی

جنگ عظیم ثانی میں آخری شکست سے کچھ ماہ پہلے جاپانی لیڈر یہ سمجھ چکے تھے کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ اتحادی طاقتوں کی طرف سے ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ کو پوٹسڈم ڈیکلریشن جاری کیا گیا تو وہ ذہنی طور پر ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ جاپانی پارلیمنٹ کی خواہش تھی کہ اس ڈیکلریشن کی بنیاد پر اتحادی طاقتوں سے امن کی گفتگو شروع کی جائے۔

باضابطہ فیصلہ سے پہلے ۲۸ جولائی کو جاپانی وزیر اعظم سوزوکی (SUZUKI) نے ایک پریس کانفرنس کی۔ انھوں نے پریس کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جاپانی کا بینہ موکو سٹسو (MOKUSATSU) کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ موکو سٹسو ایک جاپانی لفظ ہے جس کا کوئی قطعی متبادل انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود جاپانی میں بھی وہ ایک غیر واضح لفظ ہے۔ اس کا ایک مفہوم "تیسرے سے رکنا" ہے۔ اور اغلباً جاپانی وزیر اعظم کی مراد یہی تھی۔ مگر خود جاپانی زبان ہی میں اس لفظ کا ایک اور مفہوم بھی ہے، اور وہ ہے نظر انداز کرنا۔ جاپانی وزیر اعظم کو کا بینہ کی طرف سے جس بیان کی مذمت کی گئی تھی، وہ یہ تھا کہ جاپانی کا بینہ پوٹسڈم ڈیکلریشن کے معاملہ میں ابھی کسی فیصلہ پر نہیں پہنچی ہے۔ مگر انھوں نے پریس کانفرنس میں جو لفظ استعمال کیا وہ سننے والے اخبار نویسوں کے لئے مبہم ثابت ہوا۔ جاپان کی ڈومی نیوز ایجنسی نے وزیر اعظم کے بیان کا جو انگریزی ترجمہ نشر

کیا اس میں موکو سٹسو کا ترجمہ MOKUSATSU کے لفظ سے کیا گیا۔ ایک لفظ کے دو ممکن مفہوم میں سے سخت تر مفہوم کے انتخاب کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ ۴۵-۱۹۴۴ کے جاپان میں جنگی جنون کا جو ماحول تھا، اس میں "نظر اندازی" کا تصور عوامی ذوق کے زیادہ مطابق تھا۔ جاپان کے قومی حوصلوں کے لئے اس میں زیادہ تسکین مل رہی تھی۔ مگر اس لفظی تسکین کی قیمت جاپان کو بہت مہنگی ادا کرنی پڑی۔ اتحادی طاقتوں کے دفتار میں جب یہ نشر یہ سنایا تو انھوں نے سمجھا کہ جاپانیوں نے پوٹسڈم ڈیکلریشن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ چند دن بعد ہی جاپان پر دوئم بم گرائے گئے اور میریڈیشیا اور ناگاساکی تباہ ہو گیا۔ دولاکھ انسان فوراً مر گئے اور بے شمار لوگ خطرناک طور پر زخمی ہوئے۔

یہ انکشاف کا سو کوئی (KASUO KAWAI) نے کیا ہے جو اس سے پہلے جاپان کے طاقتور اخبار نمائند (NIPPON TIMES) کے ایڈیٹر تھے۔

پلین ٹر وٹھ، دسمبر ۱۹۷۰ء

یہ کوئی ایک واقعہ نہیں جو صرف جاپان کے ساتھ پیش آیا ہو۔ افراد یا قوموں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی معاملہ کو ساکھ کا معاملہ بنا لیتے ہیں وہ حقیقت پسندی کی زبان بولنے پر تیار نہیں ہوتے۔ وہ کمزور حالت میں ہونے کے باوجود ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس میں ان کی بڑائی باقی رہے۔ اس سے وقتی طور پر لفظی تسکین ضرور ہوتی ہے۔ مگر بالآخر اس کی بہت مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے۔ کیوں کہ حقائق کا طوفان ان کے الفاظ کو اسی طرح بہا لے جاتا ہے جس طرح آمدنی خس و فاشاک کو۔

چلنا وہی ہے جو صحیح سمت میں ہو

کوئی شکاری اگر جانور کے سایہ کو جانور سمجھ کر بندوق چلا دے تو اس کی گولی اپنا نشانہ کھودے گی، کار تو س خالی کرنے کے بعد بھی وہ اپنی مطلوبہ چیز سے محروم رہے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو زندگی کا نصب العین مقرر کرنے میں غلطی کر جائیں۔ اگر آپ نے نصب العین کا تعین صحیح نہیں کیا ہے تو آپ کی ساری کوششیں اور قربانیاں اسی طرح رائگاں چلی جائیں گی جس طرح کوئی شکاری غلط نشانہ پر بندوق چلا دے اور بالآخر اس کے حصہ میں خالی کار تو س کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

اس میں نصیحت ہے

انگلستان میں یہ قانون ہے کہ جانور کو ذبح نہ کیا جائے بلکہ کرنٹ کے ذریعہ ہلاک کیا جائے۔ اور اگر ذبح کیا جائے تو پہلے جانور کو سپوش کر لیا جائے۔ مگر دونوں صورتوں میں ذبح کے اسلامی حکم پر عمل نہیں ہوتا۔ تاہم پچھلے دس سال سے برطانیہ میں یقیناً مسلمانوں کو ذبیحہ کی اجازت مل گئی ہے، برٹشکم میں ۱۹۶۰ء سے ایک حلال میٹ کمپنی قائم ہے۔ اس کا کام اب اتنا بڑھ چکا ہے کہ اس وقت روزانہ تین ہزار سے چار ہزار تک جانور اور ۱۸ ہزار مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں۔ اس کا اسٹاف ۷۵ لوگوں پر مشتمل ہے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کو یہ سہولت کیونکر حاصل ہوئی، برطانیہ کے ایک مسلمان اقبال مسعود ندوی لکھتے ہیں :

”یہاں ایک اور فرقہ ہے جو اپنے طریقہ کے

مطابق جانور ذبح کرتا ہے۔ یہ یہود کا فرقہ

ہے۔ حکومت ان سے تعرض نہیں کرتی۔

ایک وجہ ان کی اقتصادی سیاسی اہمیت ہے۔

ان کا معیار بھی خاصا اونچا ہے۔ بلکہ دراصل

اس فرقہ کے ساتھ رعایت ہی کی وجہ سے

یہاں پر ذبیحہ کی اجازت مل سکی ہے۔“

الحسنات رام پور فروری ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۷

یہ واقعہ اس بات کی مثال ہے کہ اغیار کے پیدا کردہ

حالات کس طرح کبھی اسلام کے لئے مفید بن جاتے ہیں۔

اسی طرح کبھی اس کے برعکس صورت حال بھی پیش آتی ہے۔

یعنی مسلمان اپنی نادانی سے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں

کہ اسلام کے لئے موافق حالات برباد ہو جائیں۔ ایک ایسی

جدوجہد جو اسلام کے نام پر کی گئی ہو، بالآخر وہ غیر اسلامی

نتیجہ پر ختم ہو۔

یہ لکڑی کی ہنڈیا میں سالن پکانا ہے

کوئی شخص یہ نادانی نہیں کرے گا کہ اپنے گھر کا کھانا کاٹھ کی ہنڈیا میں پکائے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ چولہے کی آگ کاٹھ کی ہنڈیا کو جلا دے گی۔ اور بالآخر آدمی کے حصے میں کچھ نہیں آئے گا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ملت کا کھانا ہر آدمی کاٹھ کی ہنڈیا میں پکا رہا ہے۔ نعرے اور پوسٹر، جلسے اور کانفرنسیں، شاعری اور خطابت، احتجاج اور مطالبات، یہ سب ”کاٹھ کی ہنڈیا“ ہیں۔ مگر ہمارے تمام قائدین انھیں کے ذریعہ ملت کا مستقبل تعمیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پچھلی کئی نسلوں کے ناکام تجربات بھی ان کے جوش میں کمی کا باعث نہ ہو سکے۔

جہاز چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو چکا تھا۔
اس کے ٹوٹے ہوئے تختے سمندر کی موجوں میں ہچکولے کھا رہے تھے
سینکڑوں مسافر اپنی منزل کے بجائے سمندر کی تہ میں پہنچ چکے تھے۔
اور جہاز کا کپتان ایک تختہ کا سہارا لئے ہوئے چیخ رہا تھا۔

چیخنا

کتنی بے رحم ہے وہ قدرت جس نے سمندر میں چٹان ابھار دی
کیسی ظالم ہے وہ حکومت جس نے یہاں روشنی کا مینار تعمیر نہیں کیا
کتنے مجرم ہیں وہ جہاز ساز جنھوں نے جہاز کو حادثہ پرورد نہیں بنایا

کام

نہ

وہ چیخ رہا تھا، اور چیخ رہا تھا
مگر وہاں کوئی سننے والا نہ تھا جو اس کی چیخ کو سنے
اس کی آواز فضا میں تحلیل ہوتی رہی
یہاں تک کہ وہ بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ سمندر میں غرق ہو گیا
اس کا چیخنا اس کے کام نہ آیا اور نہ دوسروں کے۔

آیا

عقل سے کام لیجئے نہ کہ جذبات سے

کسی شخص یا گروہ کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ: وہ انتہائی جذباتی مواقع پر انتہائی عقلی فیصلے کر سکے۔ اسی کو صبر کہتے ہیں۔ زندگی ایک مسلسل امتحان ہے جس میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ آدمی جذبات سے مغلوب ہو جائے، وہ متاثر ذہن کے تحت کارروائی کرنے لگے۔ ایسے مواقع پر اپنے عقل و ہوش کو باقی رکھنا اور واقعات سے الگ ہو کر واقعات کے بارے میں فیصلہ کرنا قرآن کی اصطلاح میں صبر ہے اور یہی کسی کی کامیابی کی واحد یقینی ضمانت ہے۔ ولکم النصر ما صبرتم

وہ انھیں کھلاڑیوں کی
بی ٹیم ہوگی

Second Eleven

Mr T. A. Pai, ex-Cabinet Minister, when asked to comment on the "no-change" in the style of functioning and the poor performance of the Government, is said to have remarked: "Why should anyone have expected anything better from them? They are only our B team."

The Illustrated Weekly of India
Mar 14, 1978

مسٹر ٹی۔ اے۔ پائی اندرا حکومت میں وزیر کابینہ تھے۔ ان سے موجودہ جنتا حکومت کے بارے میں پوچھا گیا

کہ سرکاری مشین کی سست رفتاری اور اس کا طریقہ جو پہلے تھا وہی اب بھی کیوں ہے۔ حکمران پارٹی کی تبدیلی کے باوجود اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مسٹر پائی نے جواب دیا "لوگوں نے موجودہ حکومت سے کسی بہتر چیز کی توقع کیوں کر لی تھی۔ وہ آخر ہماری ہی "بی ٹیم" تو ہیں۔

اس میں ان مسلمانوں کے لئے بھی سبق ہے جو ایک ملکی پارٹی کو ہٹا کر دوسری ملکی پارٹی کو برسرِ اقتدار لانے میں ملت کے مستقبل کا سیاسی خواب دیکھا کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایک کو ہٹا کر جس دوسرے کو وہ اہر لائیں گے، وہ بھی پچھلے کھلاڑیوں ہی کی "بی ٹیم" ہوگی۔

کبھی سیاست کو ترک کرنے ہی کا نام سیاست ہوتا ہے

اکتوبر ۱۹۴۲ء میں دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ امریکہ، بحر الکاہل کے جزائر کو فتح کرتے ہوئے، جاپان کے دروازہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت جاپان کے نائس ایڈمرل اونیشی (TAKIJIRO ONISHI) نے اپنی فوج کے اعلیٰ افسروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: ”میرے خیال سے اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے جس میں ہم یقین کر سکیں کہ ہماری متولی طاقت زیادہ سے زیادہ موثر بن سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم ”زیر وفاسٹرس“ کا ایک دستہ بنائیں جو ۲۵۰ کلو گرام کا بم لے کر دشمن کے سمندری جنگی جہازوں پر اپنے آپ کو گرا دیں۔“

اونیشی کی یہ تجویز ہوا بازوں تک پہنچائی گئی۔ فی الفور منظوری کا فیصلہ ہو گیا۔ ہوا بازوں کا ایک دستہ بنایا گیا جس کا نام تھا کامی کائر (KAMIKAZE) یہ ایک جاپانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ”خدائی آندھی“۔ یہ نام اس لئے اختیار کیا گیا کیونکہ تیرھویں صدی میں قبلائی خاں کے حملہ سے ”ایک خدائی آندھی نے جاپان کو بچا یا تھا“ جس میں اس کی جنگی کشتیاں ایک سمندری طوفان نے تباہ کر ڈالی تھیں۔

اگست ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو پانچ ہزار کی تعداد میں جاپانی ہوا باز اس طرح اپنی جانیں دے چکے تھے۔ انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۲ء اور جون ۱۹۴۵ء کے درمیان ۳۳ امریکی جنگی جہازوں کو تباہ کر دیا تھا۔

جاپان کے بہادر ہوا بازوں نے کن جذبات کے

ساتھ یہ قربانیاں دی تھیں، اس کا اندازہ ایک خط سے ہو گا۔ سوسومو (SUSUMU KIJITSU) اس قسم کا ایک ۲۲ سالہ جاپانی ہوا باز تھا جس نے ایک بم لے کر اپنے ہوائی جہاز کو دشمن کے ایک سمندری جنگی جہاز پر گرایا تھا، اس نے آخری دن اپنے دفتر سے اپنے خاندان کو حسب ذیل خط لکھا:

”میرے پیارے والدین، پیارے بھائیو اور

میری پیاری بہن!

یقیناً آپ کو اس کا علم نہیں ہو گا، مگر چند دن پہلے میں نے آپ کو الوداع کہی ہے جب کہ میں اپنے گھر کے اوپر پرواز کر رہا تھا، میرے جہاز کے بازوؤں کے سایہ نے ہمارے مکان کی چھت کو چھوا۔ میرے خیالات ہمہ تن آپ کی طرف لگے ہوئے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت جلد میرا وقت آجائے گا۔ مگر مجھے موت کا ڈر نہیں۔ مجھے صرف یہ فکر ہے کہ میرا عمل کیا جاپان کو بچانے کے لئے مفید اور فیصلہ کن ثابت ہو گا۔ میں اور میرے ساتھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری قربانیاں ہمارے بعد کی نسلوں کے لئے فتح لے آئیں گی۔ ہم نہایت پرسکون ہیں۔ ہم اکثر مذاق کرتے ہیں اور اپنا وقت پڑھنے اور تاش کھیلنے میں گزارتے ہیں۔ آپ ہمارے لئے غم گین نہ ہوں۔ اس کے برعکس آپ کو فخر کرنا چاہئے کہ میرا جسم اگرچہ جلد ہی ختم ہو جائے گا مگر میری روح ہمیشہ آپ کے پاس رہے گی۔۔۔۔۔ اب الوداع، کیونکہ آخر وقت کی گھنٹی ہو چکی ہے۔

(آپ کا بیٹا اور بھائی سوسومو)

تاہم تاریخ کی یہ انوکھی قربانی جاپان کو بچانے والی ثابت نہ ہو سکی۔ کیوں کہ دشمن کے پاس ایک اور برتر طاقت تھی جس کے مقابلہ میں جاپانی ہوا بازوں کی یہ لامثال قربانی

Kamikaze: Suicide Pilots

تسلیم کر لیا اور اس کے تحت غیر سیاسی میدانوں میں اپنی ترقی و استحکام کی تدبیریں شروع کر دیں۔ اب ان کا خصوصی نشانہ تھا سائنسی تعلیم اور جدید صنعت — ”جنگ کو ختم کر کے جنگ جاری رکھنے“ کی تدبیر کا لہجہ ہی۔ ۱۹۳۵ء میں کئے گئے اس خاموش فیصلہ کا نتیجہ ۱۹۴۰ء میں برآمد ہوا۔ ۲۵ سال تک ”سیاست“ چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان ایک ناقابل تسخیر سیاسی طاقت بن گیا۔ سائنسی تعلیم، ٹکنالوجی، صنعت اور قومی کردار کی تعمیر میں جاپان نے جو غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی تھیں، اس نے اپنے بالواسطہ اثرات پیدا کرنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے لئے اس کو نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا۔ امریکہ نے جزائر جاپان کا اقتدار جاپانی باشندوں کے حوالے کر دیا۔ اس کی فوجیں ادکی ناوا میں اپنے عظیم فوجی اڈہ کو خالی کر کے اپنے وطن واپس چلی گئیں۔

بھی بے اثر تھی۔ یہ تھا ایٹم بم۔ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکی ہوائیہ نے دہ ایٹم بم جاپان کی زمین پر گرائے جس نے ہیروشیما اور ناگا ساکی جیسے عظیم صنعتی شہروں کو چاند منٹ میں خاک کا ڈھیر بنا دیا۔ اب جاپان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ تاہم جاپان کے لئے اب بھی راستے بند نہیں ہوئے۔ اب اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے ”جنگ کو جاری رکھنے کے لئے جنگ کے خاتمہ“ کا اعلان کر دیا۔ جاپان کے شہنشاہ ہیروشیما نے ریڈیو پر قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

”ہم ایک ناقابل برداشت صورت حال سے دوچار ہیں۔ مگر ہمیں اس ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیر نو کر سکیں۔“

جاپان نے امریکہ کے سیاسی اور فوجی اقتدار کو

وہ ہار کو ماننا جانتا تھا

امریکہ کے ایک شخص نے ۱۸۳۱ء میں تجارت کی۔ اس میں وہ ناکام ہو گیا۔ ۱۸۳۲ء میں اس نے انکشن میں شکست کھائی۔ ۱۸۳۳ء میں اس نے دوبارہ تجارت کی مگر اس بار بھی ناکام رہا۔ ۱۸۳۳ء میں اس کو امید تھی کہ اس کی پارٹی اس کو کانگریس کی ممبری کے لئے نامزد کرے گی۔ مگر اس کی امید پوری نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۵ء میں وہ سینٹ کے لئے کھڑا ہوا مگر ہار گیا۔ ۱۸۵۸ء میں دوبارہ اس کو سینٹ کے انکشن میں شکست ہوئی۔ یہ بار بار ناکام ہونے والا شخص ابراہام لنکن (۱۸۰۹-۱۸۶۵) تھا جو بالآخر ۱۸۶۰ء میں امریکہ کا صدر چنا گیا اور آج وہ نئے امریکہ کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل نے لنکن کی کامیابی کا راز یہ بتایا ہے: HE KNEW HOW TO ACCEPT DEFEAT: وہ جانتا تھا کہ شکست کو کس طرح تسلیم کیا جائے۔

مقابلہ کی سیاست ترک کر کے

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹-۴۵) میں جاپان اور برطانیہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس جنگ میں جاپان نے بدترین شکست کھائی۔ مگر اس کے صرف ۲۰ سال بعد یورپ کے بازار جاپانی مصنوعات سے بھرے ہوئے تھے۔ جاپان نے ۱۹۴۳ میں برطانیہ اور دوسرے پانچ یورپی ملکوں میں ۲ بلین ڈالر کا سامان فروخت کیا۔ یورپ میں چھوٹے الیکٹرانک سامان کی ۷۵ فی صد مارکٹ پر جاپان نے قبضہ کر لیا ہے۔ ۱۹۴۲ میں یورپ میں فروخت ہونے والی جاپانی کاروں کی تعداد ۲۵۰-۳۶۸ تھی۔

جاپان کو کیسے یہ موقع ملا کہ وہ اپنے حریف کی اقتصادیات پر اس طرح چھا جائے، انگلستان میں مقیم ایک جاپانی تاجر سے جب یہ سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا:

I SURRENDERED MY SWORD TO A BRITISH OFFICER AT THE END OF WORLD WAR II

Time (New York) August 6, 1973

دوسری جنگ عظیم کے بعد میں نے اپنی تلوار ایک برطانی افسر کے حوالے کر دی تھی۔ مقابلہ کی سیاست میں جاپان کو شکست ہو گئی۔ جاپان نے مقابلہ کو ترک کر کے تعمیری شیعوں میں اپنے کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ جدوجہد کے میدان کی تبدیلی کارگر ثابت ہو گئی۔ جاپان نے ”ترک سیاست“ سے وہ مقصد زیادہ بہتر طور پر حاصل کر لیا جس کو ”سیاست“ کے ذریعہ حاصل کرنے میں وہ ناکام ہو گیا تھا۔

سے زیادہ سخت ثابت ہوا۔ تشدد کو تشدد کے ذریعہ ختم کرنے کا ان کے پاس کافی وجہ جواز تھا۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ عدم تشدد کے اصول پر اٹھنے والے طوفان کا مقابلہ کس طرح کریں۔ جب یہ صورت حال سامنے آئی تو ایک پرانے انگریز کلکٹر نے سکرٹریٹ کو تار دیا:

KINDLY WIRE INSTRUCTIONS HOW TO KILL A TIGER NON-VIOLENTLY

برائے مہربانی بذریعہ تار ہدایات بھیجیے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح ہلاک کیا جائے۔

اکثر لوگ سیاست کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حریف سے لامتناہی لڑائی جاری رکھی جائے۔ مگر اصل سیاست یہ ہے کہ خاموش تدبیر کے ذریعہ حریف کو اس طرح بے اختیار کر دیائے کہ وہ لڑنے کے قابل نہ رہے۔

عدم تشدد کا ہتھیار تشدد

سے زیادہ سخت ثابت ہوا

ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی۔ ابتدائی ۵۰ سال تک یہ تحریک تشدد کے طریقہ پر چلتی رہی۔ ۱۹۱۹ء میں مہاتما گاندھی ہندوستان کی سیاست میں داخل ہوئے تو انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنسا کی بنیاد پر آزادی کی تحریک چلائیں گے۔

انگریز حکمران کے لئے گاندھی جی کا عدم تشدد کا ہتھیار پچھلے ”مجاہدین آزادی“ کے تشدد کے ہتھیار

حقیقی واقعہ صرف حقیقی عمل کے ذریعہ وجود میں آتا ہے

آپ کے کمرہ کی دیوار پر جو کیلنڈر ہے، اس پر ۱۹۷۷ کا سنہ لکھا ہوا ہے۔
اگر آپ چائیز کیلنڈر کے اوپر ۲۰۷۷ کا سنہ لکھا ہوا نظر آئے تو اس کے
لئے آپ کو پوری ایک صدی تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک خود ساختہ کیلنڈر
پر آپ جو ہندسہ چاہیں اپنے ہاتھ سے لکھ لیں۔ مگر وہ کیلنڈر جو دنیا کے
نزدیک بھی کیلنڈر ہو، اس پر ۲۰۷۷ کا ہندسہ دیکھنے کے لئے سو سالہ
انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس دنیا میں کیلنڈر کے لئے جو قانون ہے، وہی ملی تعمیر کا بھی قانون ہے،
نعموں اور خوشحالی تقریروں میں ملت کا مستقبل دیکھنا ہو تو کسی بھی صبح و
شام لفظوں کا سیلاب بہا کر اس قسم کا ایک خیالی عمل کھڑا کیا جاسکتا ہے۔
مگر حقیقی مستقبل کی تعمیر طویل جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔

محرومی اُس وقت محرومی ہے جب کہ وہ آدمی کے اندر تلخی
اور مایوسی پیدا کرے۔ مگر محرومی اس وقت ترقی کا زینہ
بن جاتی ہے جب کہ وہ آدمی کی دبی ہوئی قوتوں کو جگانے
والی ثابت ہو

بچوں کا گھروں دا جتنی دیریں بنتا ہے اس سے بھی کم مدت میں زمیں بوس ہوتا ہے

مقرر ہے، وہ یہ کہ دوبارہ وہ زمین پر گریں اور قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لیے باقی رہ جائیں۔

مگر یہی ہوا میں پانی کے قطروں کو بھی پرواز پر آمادہ کرتی ہیں۔ مگر یہاں معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ قطرے فضا میں جا کر بادل بنتے ہیں، پھر وہ بارش کی شکل میں زمین پر برستے ہیں۔ اس کے بعد نالوں اور ندیوں سے ہوتے ہوئے سمندر میں پہنچتے ہیں اور بالآخر اس عظیم آبی چادر کا حصہ بن جاتے ہیں جو دائمی طور پر پورے کرۂ ارض کو لپیٹے ہوئے ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ ہماری سرگرمیوں کا بھی ہے۔ سطحی اور غیر دانش مندانہ سرگرمیاں انسانوں کو صرف گڑھے میں گرانے کا باعث ہوتی ہیں اور جن سرگرمیوں کی بنیاد گہری بصیرت پر ہوتی ہے وہ آدمی کو ترقی کے آسمان پر پہنچا دیتی ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے درمیان ہم نے اس ملک میں قومی تعمیر کے نام سے زبردست ہنگامہ آرائی کی ہے مگر یہ کوششیں اس انجام پر ختم ہوئی ہیں کہ آج ہم صرف گرد راہ بن کر انسانی قافلوں کے قدموں کے نیچے پامال ہونے کے لئے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہم کو جدوجہد کا جو طویل موقع ملا اور اس میں جو سنہری امکانات ہمارے لیے چھپے ہوئے تھے اگر ہم نے دانش مندی کے ساتھ انھیں استعمال کیا ہوتا تو آج ہم زمین پر چھائے ہوئے ہوتے۔ فریاد ماتم کے بجائے ہم فیصلہ کرنے والے کی پوزیشن میں ہوتے۔ ہمارے لیے آسمانی پرواز بھی مقدر تھی۔ مگر ہماری بے بصیرت کی وجہ سے صرف زمین کی پامالی کا انجام ہمارے حصہ میں آیا ہے۔

ایک طالب علم کے سرپرست کالج کے پرنسپل سے ملے۔ ”آپ لوگوں نے جو تعلیمی نصاب بنایا ہے وہ بڑا طویل ہے۔ طالب علم کی عمر کا بڑا حصہ صرف پڑھنے میں گزر جاتا ہے۔“ انھوں نے کہا۔

”اس کا حل تو بہت آسان ہے“ پرنسپل نے جواب دیا۔ ”آپ مختصر نصاب بھی بنا سکتے ہیں۔ اصل میں مدت کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ طالب علم کے اندر کس درجہ کی لیاقت دیکھنا چاہتے ہیں۔ قدرت کو شاہ بلوط (Oak) کا درخت تیار کرنے میں سو برس لگ جاتے ہیں مگر جب وہ لکڑی اگانا چاہتی ہے تو اس کے لیے صرف چند مہینے درکار ہوتے ہیں۔ اگر آپ معمولی قسم کا علمی معیار چاہتے ہوں تو چند سال کا تعلیم بھی کافی ہو سکتی ہے مگر اعلیٰ تعلیم یا نئے بنانے کے لیے تو بہر حال زیادہ وقت دینا پڑے گا۔“

یہی حال قومی تعمیر کا بھی ہے۔ اگر آپ ٹھوس اور دیرپا تعمیر چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ کو صبر آزما انتظار کے مرحلہ سے گزرنا ہوگا اور لمبے عرصہ تک سسل محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر آپ بچوں کا گھروں دا بنانا چاہتے ہوں تو پھر صبح شام میں ایسا گھروں دا بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ البتہ ایسی حالت میں آپ کو اس حادثہ کا سنا کرنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے کہ جتنی دیر میں آپ کا گھروں دا بن کر کھڑا ہوا ہے اس سے بھی کم مدت میں وہ دوبارہ زمیں بوس ہو جائے۔

ہو اس جلتی ہیں تو گرد و غبار اٹھ کر فضا میں اڑنے لگتے ہیں مگر گرد و غبار کی پرواز کیلئے آخری طور پر جو انجام

کبھی سست رفتاری زیادہ عظیم ہوتی ہے

تارکوں کی چمکتی سڑک پر نئی کار تیزی سے پھسل رہی تھی۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے ایک کسان ٹریکٹر کی پیٹھ پر بچکولے کھا رہا تھا۔ وہ ٹیلوں اور کھائیوں کو ہمار کر رہا تھا تاکہ اس کو فصل اگانے کے قابل بنائے۔ کار کے لئے کوئی ٹھہراؤ نہیں تھا جبکہ ٹریکٹر کو جگہ جگہ ٹھہ کر لگ رہی تھی۔ اس کو بار بار رکتا پرتا تھا۔

کار کے مقابلہ میں ٹریکٹر کی یہ حالت کسی بھی درجہ میں اس کی اہمیت کو نہیں گھٹاتی۔ کار بنے بنائے راستہ پر دوڑ رہی ہے، جبکہ ٹریکٹر خود اپنا راستہ بنا رہا ہے۔ ایک ماضی میں سفر کر رہا ہے، دوسرا مستقبل کی طرف مارچ کر رہا ہے۔ ایک تاریخ کے اندر گم ہے، دوسرا اپنی جدوجہد سے خود ایک تاریخ بنا رہا ہے۔

ٹریکٹر کی سست رفتاری میں بڑی عظمتیں چھپی ہوئی ہیں، اس کے مقابلہ میں کار کی تیز رفتاری کی کوئی حقیقت نہیں۔

دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک خود اپنے لئے مفید ہوتا ہے

شیخ سعدی شیرازی (۶۹۱-۵۸۹ھ) کی کتاب بوستان کے شروع میں ایک حکایت درج ہے۔ اس کا عنوان ہے: ”پسند دادن کسرے ہر مزرے“ اس حکایت کے مطابق ایران کا بادشاہ نوشیرواں جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنے جانشین ہرمز کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ ان میں سے ایک نصیحت، سعدی کے الفاظ میں، یہ تھی:

مراعات دہقان کن از بہر خویش کہ مزدور خوش دل کند کار بیش

یعنی چودھریوں اور سرداروں کے ساتھ رعایت کرو، اس سے خود تم کو فائدہ ہوگا۔ کیوں کہ مزدور جب خوش ہو تو وہ کام زیادہ کرتا ہے۔

یہ کام ہے بالیڈری

ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی (۱۹۴۳-۱۹۱۳) ابتداء میں آل انڈیا امن کونسل کے ممبر تھے۔ اس کے بعد اس سے علیحدہ ہو گئے اور اولاً آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور اس کے بعد مسلم مجلس کے ذریعہ کام کرتے رہے۔ امن کونسل سے اپنی علیحدگی کے بارے میں ایک شخص کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا :

”جب جبل پور میں بد امنی (۱۹۶۳) ہوئی تو میں نے کونسل سے کہا کہ چلو جبل پور چل کر کچھ کام کریں۔ مگر ان لوگوں نے میری بات نہ مانی۔ وہ بین الاقوامی امن کی بات تو کرتے تھے۔ مگر انھیں گھر کی بد امنی رفع کرنے کے کام سے دل چسپی نہ تھی۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگی اور محسوس ہوا کہ ایسی تنظیم سے میرا تعلق رکھنا بے کاری بات ہے۔ اس لئے میں نے استعفا دے دیا“ (الحسنات اگست ۱۹۷۷)

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جو بات امن کونسل کے بارے میں کہی، وہ صد فی صد صحیح ہے، صرف اس اضافہ کے ساتھ کہ خود ہمارے رہنماؤں کا حال بھی یہی ہے۔ ہمارا تقریباً ہر رہنما، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، عالمی کاموں سے خصوصی دل چسپی رکھتا ہے۔ اپنے گھر، اپنے محلہ، اپنے ادارہ اور اپنے قریبی دائرہ میں اس کے لئے جو کام ہیں اس میں مصروف ہوتا وہ اپنے لئے چھوٹی بات سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس آل انڈیا اجتماعات کی صدارت اور بین الاقوامی نمائش گاہوں میں تقریری کمال دکھانا اس کو زیادہ پسند ہے۔ موجودہ زمانہ میں ملت کی بربادی کی، انٹر نل نہیں تو کم از کم ایک بڑی وجہ، یقیناً یہی ہے۔

اللہ کے سامنے سرخروئی حاصل کرنے کا جذبہ آدمی کو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مگر انسانوں کے سامنے سرخروئی حاصل کرنے کا شوق ہو تو آدمی کو ”باہر“ کی فکر زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ عام انسانوں کو وہی ”کام“ زیادہ نظر آتے ہیں جو دور دور کئے گئے ہوں۔

سفر ابتداء سے شروع ہوتا ہے نہ کہ درمیان سے

سفر کا آغاز جب بھی ہو گا وہیں سے ہو گا جہاں آدمی فی الواقع کھڑا ہوا ہے — ایک شخص دہلی میں ہے اور بمبئی پہنچنا چاہتا ہے، ایسے شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دادر سے اپنا سفر شروع کرے۔ اس کو ہڑل دہلی سے چلنا ہو گا۔ دادر سے سفر شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سفر کبھی شروع ہی نہ ہو۔

“We must start again from scratch . . .”

ہم کو ابتدائی نقطہ سے اپنا سفر شروع کرنا ہے۔ کوئی شخص اگلی منزل سے اپنے سفر کا آغاز نہیں کر سکتا۔

الٹی سمت میں

احساس ان کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ وہ بدستور غلط راستہ پر چلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ تباہی کے گرہے میں جاگرتے ہیں۔ احیاء ملت کا سفر بھی موجودہ زمانہ میں کچھ اسی نوعیت کا ہو گیا ہے۔ لوگ الٹی سمت میں بھاگے جا رہے ہیں وہ بھول گئے ہیں کہ الٹی سمت میں سفر آدمی کو منزل سے اور دور کر دیتا ہے نہ کہ اس سے قریب۔

مسائل کا حل خاموش منصوبہ میں نہ کہ پُر رونق ہنگاموں میں

اسرائیل کے وزیر اعظم مئیر بنن سے پوچھا گیا ”کیا اسرائیل اس کے لئے تیار ہے کہ مقبوضہ مغربی اردن اور فلسطینیوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے گفتگو کرے“ انھوں نے جواب دیا:

WE WILL FIND A SOLUTION TO THE PALESTINIAN PROBLEM, BUT NOT IN FRONT OF THE TELEVISION CAMERAS

ہم فلسطینی مسئلہ کا حل پالیں گے۔ مگر ٹیلی ویژن کیمروں کے سامنے نہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۳ دسمبر، ۱۹۷۷ء)

قوموں کے مسائل کا حل خاموش منصوبہ بندی میں ہوتا ہے۔ مگر اکثر قائدین اس کو پُر رونق ہنگاموں میں تلاش کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس طرح دو فائدوں میں سے کم از کم ایک فائدہ یقینی طور پر حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ قائد کی اپنی شخصیت بہر حال نمایاں ہو جاتی ہے۔ خواہ قوم کا مسئلہ حل ہو یا نہ ہو۔

ایک لطیفہ ہے کہ دہلی میں ایک مسافر کناٹ پلیس کی سڑک پر چل رہا تھا۔ اس کو پارلیمنٹ ہاؤس جانا تھا۔ مگر اس کا رخ الٹی طرف تھا۔ اس نے راستہ میں ایک شخص سے پوچھا: ”پارلیمنٹ ہاؤس یہاں سے کتنی دور ہوگا“ جواب دینے والے نے کہا ”تقریباً ۲۵ ہزار میل“۔ مسافر یہ سن کر گھبرا گیا۔ ”جناب میں آپ سے راستہ پوچھ رہا ہوں اور آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں“ اس نے کہا: معاف کیجئے گا۔ میں نے مذاق نہیں کیا۔ اصل میں آپ پارلیمنٹ ہاؤس کے الٹی طرف چل رہے ہیں۔ اس لئے اگر آپ یوں ہی چلتے رہے تو زمین کا پورا چکر کرنے کے بعد ہی آپ اپنی منزل پر پہنچ سکیں گے جس کی گولائی ۲۵ ہزار میل ہے۔ یہ بات بھی اس وقت ہے جب کہ آپ عرض البلد کے ٹھیک اس خط پر چل رہے ہوں جس پر پارلیمنٹ ہاؤس واقع ہے۔ اگر آپ کچھ دائیں بائیں ہو گئے تو زمین کا بار بار چکر کرنے کے بعد بھی آپ اپنی منزل کو پانے سے محروم رہیں گے۔“

پارلیمنٹ ہاؤس کا کوئی مسافر اس قسم کی غلطی نہیں کرے گا۔ کیونکہ لوگ اپنے دنیوی معاملات میں اتنے نادان نہیں ہوتے کہ اپنی غلطی واضح ہونے کے بعد بھی بدستور اُسی راہ پر چلتے رہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ دین کے شدید تر معاملہ میں بیشتر لوگ اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ واضح کرنے والے ان کی غلطیاں واضح کرتے ہیں۔ ان کا دل بھی گواہی دیتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ مگر شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اس کو عزت کا سوال بنا لیتے ہیں۔ ”اگر میں نے اس کے کہنے سے اپنی غلطی مان لی تو میں چھوٹا ہو جاؤں گا“ یہ

کامیابی کا راز یہ ہے کہ —
آدمی اپنی ناکامی کے راز کو جان لے



پختگی اس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی ان چیزوں کے ساتھ پر امن طور پر رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔

پختگی انکساری کا نام ہے۔ ایک پختہ انسان یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ ”میں غلطی پر تھا۔“



سورج ایک بے حد روشن حقیقت ہے۔ مگر جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے، اس کے لئے سورج کا کوئی وجود نہیں۔



ذاتی نقصان کا اندیشہ ہو تو آدمی فوراً حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے لگتا ہے۔ مگر ملی معاملات میں دلائل کا انبار بھی کسی کو حقیقت پسند بنانے کے لئے کافی نہیں۔



کبھی جانتا اس کا نام ہوتا ہے کہ آدمی یہ کہہ دے کہ ”میں نہیں جانتا“

اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ
کیجئے آپ کو دوسروں سے
کوئی شکایت نہ ہوگی

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ البتہ وہ اس کے لئے نرم ہو جاتا ہے جس نے اس کو توڑنے کا اوزار فراہم کر لیا ہو۔ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو ہر جگہ آپ اپنا حق وصول کر کے رہیں گے۔ اور اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی مفروضہ حق تلفی کے خلاف فریاد فغاں کرتے رہیں۔

ماحول سے کوئی امید نہ رکھئے، بلکہ اپنی محنت اور لیاقت پر بھروسہ کیجئے۔ آپ کو ماحول سے کبھی شکایت نہ ہوگی۔ ماحول کی شکایت دراصل ماحول سے زیادہ خود اپنی نالائقی کا اظہار ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہ ناگزیر تیاری نہیں کی تھی جو ماحول سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے ضروری ہے۔

ناکامی کی وجہ

شریف کمال ایک اخوانی رہنما ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اخوان المسلمین کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاست میں قبل از وقت داخل ہو گئے۔ تدخلنا فی السياسة قبل وقتها

برتر سطح سے کام کرنے کا ذہن پیدا کیجئے

کا کردگی کا نصاب پر کر کے
آپ اپنے لئے جگہ حاصل
کر سکتے ہیں۔

جاپان میں نظر آتا ہے تو وہ آنا فانا ملک کی تعلیم پر چھپا جائے گا اور جو گروہ اقتصادیات پر قابض ہو جائے وہ لازمی نتیجہ کے طور پر دوسرے شعبوں پر بھی قابض ہو کر رہتا ہے۔

دنیا میں اپنی جگہ بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ——— جس آسانی کے لئے بی اے کی قابلیت کی شرط ہو اور بی اے والوں نے درخواست دے رکھی ہوں۔ وہاں آپ بھی اپنی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچ جائیں اور حیب آپ کو نہ لیا جائے تو بحث کریں کہ کیوں آپ کے مقابلے میں دوسرے امیدوار کو ترجیح دی گئی جبکہ دونوں یکساں طور پر گزری ہوئے تھے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ جہاں لوگ بی اے کی سند پیش کر رہے ہوں وہاں آپ ماسٹر ڈگری لے کر پہنچیں جہاں لوگ مطابق شرائط قابلیت کی بنیاد پر اپنا حق مانگ رہے ہوں وہاں آپ برتر از شرائط قابلیت دکھا کر اپنا حق تسلیم کرائیں۔

یہی دوسرا طریقہ زندگی کا اصل طریقہ ہے۔ تمام بڑی بڑی ترقیاں اور کامیابیاں انھیں کے لئے مقدر ہیں جو اس دوسرے طریقے کے مطابق کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔

کسی شہر میں کپڑے کی دوکان نہ ہو تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک سنہری موقع ہے جس کو استعمال کر کے کوئی شخص شہر میں ایک کامیاب دوکان کا مالک بن سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں ایک اس سے بھی زیادہ بڑا خطا ہے جس کو ابھی تک کسی نے استعمال نہیں کیا۔ ہمارے ملک کے بھرے ہوئے دفاتر اور ہمارے پر رونق بازار جہاں ہر وقت خرید و فروخت کے گنگامے جاری رہتے ہیں اپنی ساری ہماہمی کے باوجود ابھی تک خالی ہیں۔

آپ بازار سے کوئی ملک کی بنی ہوئی چیز خریدیں، چند ہی روز کے تجربے کے بعد آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کو اپنی پسند کی چیز نہیں ملی۔ آپ اپنے کام کے لئے ملازم رکھئے، بہت جلد آپ محسوس کریں گے کہ آپ جیسا کارکن چاہتے ہیں، آپ کا ملازم ان اوصاف میں پورا نہیں اترتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بازار اگرچہ سامانوں سے پٹے ہوئے ہیں مگر وہ ان چیزوں سے خالی ہیں جو حقیقتاً گاہک کو مطمئن کرنے والی ہوں۔ اسی طرح وہ جگہیں جہاں آدمی کو کام ملتا ہے اگرچہ بظاہر بھری ہوئی ہیں۔ مگر انھیں اب بھی ایسے کارکنوں کا انتظار ہے جو ان کی مرضی کے مطابق ان کا کام پورا کر سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ساارا ملک ایک عظیم خامی دوچار ہے۔ اور یہ خامی اعلیٰ مصنوعات اور بہتر کارکردگی کا خلا ہے۔ اگر کوئی گروہ ہو جو محنت اور مٹی دایتداری میں اعلیٰ معیار دکھائے جو مثال کے طور پر جرمنی اور

مسلم قیادت موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ اس کی یہ غلطی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مستقبل کو تعمیر کے بجائے سیاست میں تلاش کیا۔ سیاست بازی کا مطلب ہے، اپنے مسائل کے حل کے لئے دوسروں کے خلاف ہم چلانا۔ جب کہ تعمیر ہے کہ اپنے مسائل کے لئے خود اپنے اوپر عمل کیا جائے۔

کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ قوم کو اس حیثیت سے تیار کیا جائے کہ لوگوں کے عفت آمد مضبوط ہوں، ان کے اندر اخلاق کی طاقت ہو، وہ تعلیم میں اپنے ہوں، ان میں باہم اتحاد ہو اقتصادی شعبوں میں انہوں نے اپنی جگہ بنائی ہو۔ سماجی بہبود کے ادارے ان کے درمیان چل رہے ہوں۔ وہ زمانے کو سچا نہیں اور اس کے مطابق کام کرنا جانتے ہوں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے اندر وہ شعور ابھارا جائے کہ وہ صاحبِ نظریہ افراد کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان رہ سکیں۔ انہیں چیزوں کے اوپر کسی قوم کی زندگی کا دار و مدار ہے لیکن مسلمانوں نے دوسروں کے خلاف سیاسی ہنگامہ آرائی تو خوب کی، خود اپنی تعمیر کے لئے کوئی کام نہ کیا۔

مزید نادانی یہ ہے کہ سیاست بازی سے جب وہ کامیاب نہ ہو سکے تو اب انہوں نے دوسرا مشغلہ یہ اختیار کیا ہے کہ اپنی ناکامی کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی باتوں سے وہ صرف یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن کے الفاظ میں انہوں نے کلمہ طیبہ کا درخت نہیں اگایا تھا، بلکہ کلمہ خبیثہ کا درخت اگایا تھا۔ کیونکہ کلمہ طیبہ کے درخت کے لئے خدا کا اعلان ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ یہ انجام صرف کلمہ خبیثہ کے درخت کے لئے مقدر ہے کہ جو چاہے ہاتھ بڑھا کر اس کو اکھاڑ لے۔ (ابراہیم)

ایمان یہ ہے کہ جب کوئی غیر معمولی بات پیش آئے تو آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خدا پرستی جاگے

آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ کبھی آرام کبھی تکلیف، کبھی تعریف کبھی تنقید۔ کبھی خوشی کبھی غم۔ یہ اتار چڑھاؤ سب امتحان کے پرچے ہیں۔ کامیابی یہ ہے کہ ان واقعات سے آدمی کے اندر نفسانیت نہ جاگے بلکہ خدا پرستی جاگے۔ خوشی اور آرام ہو تو اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے۔ کسی سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کے اندر عجز اور عبدیت کی روح پیدا ہو۔

۱۹۷۵ء میں شیخ مجیب الرحمن اور ان کے کاہنی رفقاء مسٹر تاج الدین احمد، مسٹر قمر الزماں، مسٹر نذرا الاسلام اور دوسرے بہت سے لوگ قتل کر دیئے گئے تھے۔ اس واقعہ سے کسی قدر پہلے اپریل ۱۹۷۵ء میں بنگالی صحافی مسٹر سکھ رجن داس گپتا ڈھاکہ گئے تھے اور بنگلہ دیش کے لیڈروں سے ملے تھے۔ انھوں نے بنگلہ دیش کے نوین واقعات پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

The Midnight Massacre in Dacca

مسٹر گپتا کے بیان کے مطابق اپریل ۱۹۷۵ء میں جب وہ دوسرے ہندوستانی صحافیوں کے ساتھ ڈھاکہ پہنچے تو وہاں مجیب حکومت کو ختم کرنے کی افواہیں گرم تھیں۔ مسٹر قمر الزماں سے جب وہ ان کی رہائش گاہ پر ملے تو موصوف کے الفاظ میں:

The first thing he asked for was the tin of Zarda

پہلی چیز جو انھوں نے مجھ سے مانگی وہ زردہ تھا۔ میں نے بتایا کہ میں ان کے لئے زردہ کا ایک ڈبہ لایا ہوں۔ مسٹر تاج الدین سے جب وہ ان کے مکان پر ملے تو انھوں نے مسٹر گپتا سے فرمائش کی کہ وہ ایشور چندر دیا ساگر کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ کتابیں ان کو فراہم کر دی گئیں۔ مسٹر خوند کر مشتاق جو اس وقت ٹریڈ اور کامرس کے منسٹر تھے، انھوں نے شکایت کی کہ کلکتہ کے اخبارات نے اپنے صفحات میں ان کو اتنی جگہ نہیں دی جتنی انھوں نے مسٹر تاج الدین اور مسٹر نذرا الاسلام کو دی۔ مسٹر داس گپتا لکھتے ہیں میں سمجھ نہ سکا کہ وہ شیخ مجیب کے خلاف اپنی شکایت کو میرے جیسے ایک غیر ملکی صحافی سے کیوں بیان کر رہے ہیں

”۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو پاکستانی فوج نے بنگلہ دیش میں مار دھاڑ کیوں شروع کی؟“ مسٹر تاج الدین نے بتایا کہ الیکشن کے بعد ہم نے خفیہ منصوبہ بنایا کہ بنگلہ دیش کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیں۔ یہ منصوبہ خوند کر مشتاق کے فیصلہ پاکستان کے لیڈروں تک قبل از وقت پہنچ گیا اور انھوں نے فوجی کارروائی شروع کر دی،“

کام کا آغاز خود اپنی ذات سے

”ہماری قوم جاہل ہے، آپ اس کی جہالت دور کرنے کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟“
”آپ نے خود کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟“
”میں تو بد قسمتی سے کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکا۔“
”پھر آپ یہ کیجئے کہ فوراً کسی تعلیمی ادارہ میں داخلہ لے لیجئے۔ اگر آپ نے
پڑھ لیا تو قوم کا کم سے کم ایک جاہل کم ہو جائے گا۔“

دو شخصوں کی گفتگو بتاتی ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے کرنے کا کام کیا
ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسروں کو تلقین کرنے کے بجائے ہر شخص اپنے کام میں
لگ جائے۔ زندہ قوم کی علامت یہ ہے کہ اس کا ہر شخص ”میں کیا کروں“
کے سوال پر سوچتا ہے۔ اس کے برعکس جب قوم کے افراد ”دوسرے کیا
کریں“ کے سوال پر بحث کرنے لگیں تو سمجھنا چاہئے کہ قوم مر چکی ہے۔ اس
قسم کی حرکت موت کی حرکت ہے نہ کہ زندگی کی حرکت۔

اقدام سے پہلے تیاری ضروری ہے

عربی کا ایک مثل ہے: قبل التّامّی یُراش السّهم (تیر مارنے سے پہلے تیر کو کمان میں ٹھیک طریقے سے
جمایا جاتا ہے) تیر کو کمان میں اچھی طرح بٹھائے بغیر تو نہی چلا دیا جائے تو وہ کبھی نشانہ پر نہیں لگے گا۔ اسی طرح
کوئی اقدام ضروری تیاری کے بغیر کیا جائے تو اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔

یا الہی یہ ماجرا کیا ہے

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۳ء میں "دارالارشاد" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ ادارہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"ہمارے کاموں کی بڑی قسمیں صرف دو ہی ہیں۔ مسلمانوں کی داخلی اصلاح و احیائے علم و عمل، اور غیر قوموں میں اسلام کی تبلیغ۔ یہ دونوں کام بغیر کسی ایسی جماعت کی موجودگی کے انجام نہیں پاسکتے۔ جس قدر تحریکیں، انجمنیں، کانفرنسیں اور متفرق کوششیں بغیر اس کے ہوں گی، وہ اسی طرح ضائع ہو جائیں گی جس طرح اب تک ضائع ہو چکی ہیں۔" ابلاغ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء

چالیس سال پہلے مولانا آزاد کا یہ تجربہ کس قدر صحیح تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ دنوں بعد وہ ان دنوں کاموں کو چھوڑ کر "متفرق کوششوں" بالفاظ دیگر سیاست کی لائن پر چل پڑے۔ اگرچہ وہ آخر وقت تک یہی اعلان کرتے رہے کہ ۷ میں نے ۶ سال کی عمر میں اپنے لئے جو راستہ مقرر کیا تھا، اسی پر میں آج بھی قائم ہوں۔ یہی موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام شخصیتوں کا حال ہوا ہے۔ وہ آغاز میں ایک خالص دینی مقصد کے لئے اٹھیں۔ مگر دھیرے دھیرے ان کی گاڑی سیاست کی پٹری پر سوار ہو گئی۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر ایک آخر وقت تک یہی اعلان کرتا رہا کہ وہ اب بھی اسی مقصد پر قائم ہے جو اس نے شروع میں اپنے سامنے رکھا تھا۔

وقت گزرنے کے بعد

MR ATAL BEHARI VAJPAYEE,
EXTERNAL AFFAIRS MINISTER,
CONFESSED HERE TODAY THAT
HE HAD FOUND MAHATMA GANDHI
WANTING AT THE TIME OF INDIA'S
PARTITION IN HIS APPROACH TO
THE COMMUNAL QUESTION.

The Times of India, 31.1.1978

وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری واجپائی نے اپنی تقریر میں اعتراف کیا کہ اُس وقت ان کا خیال تھا کہ مہاتما گاندھی نے ملک کی تقسیم کے وقت فرقہ وارانہ سوال پر جو موقف اختیار کیا، وہ قومی معیار سے گرا ہوا تھا۔ مگر اب وہ سمجھتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کا موقف ہی درست تھا (حقیقت پسند رہنماؤں کے ساتھ اکثر یہ المیہ پیش آتا ہے کہ ان کے وقت کے پر جوش لوگ ان کے موقف کو پست مہتی کا موقف سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ بعد کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ وہی زیادہ صحیح اور قابل عمل تھا۔

۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو مہاتما گاندھی کو گولی سے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے ہر سال یہ دن "یوم شہیداں" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۸ء کو اس موقع پر جو تقریبات ہوئیں، ان میں سے ایک یہ تھا کہ برطانوی نو بول انعام یافتہ لارڈ فلپ نوبل بیکر کو لکچر کے لئے مدعو کیا گیا۔ اس اجتماع کی صدارت مسٹر اٹل بہاری واجپائی نے انجام دی۔

مسٹر واجپائی، جو اس وقت ہندستان کے وزیر خارجہ ہیں، ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر شیام پرشاد کمر جی (مہندو مہاسنا) کے پرسنل سکرٹری تھے۔ مسٹر واجپائی کی صدارتی تقریر کی جو رپورٹ اخبارات میں آئی ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے۔

صحیح کوشش کرنے والے کے لئے

ناکامی کا سوال نہیں

جو حرکت کرنا چاہے اس کا راستہ بھی بند نہیں ہوتا — گیس نیچے نہیں ساتی تو دیر الٹ کر اپنے لیے جگہ حاصل کرتی ہے۔ پانی کو اونچائی آنکے بڑھتے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف بہہ کر اپنا راستہ بنالیتا ہے۔ درخت سلح پر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین کو پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کرتا ہے۔

یہی طریقہ آپ کو بھی اختیار کرنا ہے، آپ کا پہلا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو سمجھیں، اپنی قوتوں کو صحیح ڈھنگ سے ترتیب دیں اور پھر ماحول کو سمجھ کر ماحول کے اندر اس طرح گھسیں کہ اسکے مقابلہ میں اپنی اہلیت ثابت کر کے اپنے آپ پوری طرح مسلح ہوں۔ حالات سے اپنی اہمیت منوانے کے لیے آپ سے ضروری سامان کر لیا ہو۔

لیاقت پیدا کیجئے اور دانش مندی کے ساتھ اپنے لئے راہ نکالئے، اس کے بعد آپ کو کبھی ماحول سے شکایت نہ ہوگی۔ زندگی کی کسی منزل پر آپ اپنے کو ناکام محسوس نہیں کریں گے۔ ناکامی اور بایوسی صرف وہیں آتی ہے جہاں زندگی کی ضروری شرطیں پوری کرنے میں کوئی کوتاہی رہ گئی ہو۔

ناکامی تیاری کے ساتھ کیا ہوا اقدام مسئلہ کو پہلے سے زیادہ سنگین بنا دیتا ہے

ڈیگال ازم: اپنی مقبولیت کی قیمت پر قوم کے مستقبل کی تعمیر

ہندوستان کے وزیر خارجہ مسٹر ایل بی جی نے فروری ۱۹۷۸ء کے پہلے ہفتہ میں پاکستان کا دورہ کیا۔ اس موقع پر پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیا راجہ نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

THE BEST DESCRIPTION I CAN
GIVE OF MR VAJPAEYEE IS THAT
AS A POLITICIAN IN OFFICE
HE IS DIFFERENT FROM WHAT
HE WAS IN THE OPPOSITION.

مسٹر جی کے بارے میں بہترین الفاظ جو میں کہہ سکتا ہوں، وہ یہ کہ بحیثیت وزیر حکومت وہ اس سے مختلف ہیں جیسے کہ وہ اس وقت تھے جب کہ وہ اپوزیشن میں تھے۔ دونوں ملکوں کے لیڈروں کے درمیان اسلام آباد میں جو گفتگو ہوئی، اس میں کشمیر کا مسئلہ نمایاں رہا۔ اس واقعہ کے باوجود کہ دونوں ممالک اپنے تعلقات کو مستحکم بنانے کے لئے پوری طرح سنجیدہ تھے، طرفین نے محسوس کیا کہ کشمیر کا مسئلہ دونوں کے تعلقات کو معمول پر لانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، کیونکہ:

THE PUBLIC OPINION IN INDIA,
WAS VERY SENSITIVE ON THIS
SUBJECT.

ہندوستان کی رائے عام اس مسئلہ کے بارے میں بے حد حساس ہے۔ دوسری طرف جنرل ضیا راجہ نے صفائی کے ساتھ کہا کہ بنیادی شکل یہ ہے کہ:

WE ARE ALLERGIC ON KASHMIR

کشمیر کے معاملہ میں ہم پاکستانی الارجیک واقع ہوئے ہیں۔
ڈائمنس آف انڈیا، ۱۷ فروری ۱۹۷۸

یہ اخباری رپورٹ بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ کی ”جمہوری سیاست“ کس تضاد سے دوچار ہے۔ ایک لیڈر جیت تک ایوان حکومت کے باہر ہوتا ہے، وہ آئین تقریریں کرتا ہے، کیونکہ ہندو پاک جیسے علاقہ میں عوامی لیڈر بننے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ مگر اس کی سیاسی مقبولیت جب اس کو حکومت کی کرسی پر پہنچا دیتی ہے تو معاملہ بدل جاتا ہے۔ اب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لئے حقیقت پسندی کی ضرورت ہے۔ مگر یہاں عوام کی وہی جذباتیت، حقیقت پسندانہ سیاست کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے جو اس سے پہلے حزب اختلاف کی سیاست چلانے کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ اس تضاد کا واحد حل ”ڈیگال ازم“ ہے یعنی اپنی مقبولیت کی قیمت پر ملک کے مستقبل کی تعمیر۔ جنرل ڈیگال (۱۸۹۰-۱۹۷۰) نے ابھیریا کو آزاد کر کے اچانک فرانس کو یورپ کا سب سے طاقتور ملک بنا دیا۔ اگرچہ اس کے بعد ڈیگال کی اپنی سکا زندگی ختم ہو گئی۔ ڈیگال ازم عملاً سیاسی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ اور خودکشی کی معروف قسم جتنی عام ہے، یہ دوسری قسم اتنی ہی کیاب ہے۔

حقیقی لیڈر وہی ہے جو قوم کو حقیقی عملی چیز دے سکے۔ اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب کہ لیڈر ہر حال میں حقیقت پسندانہ سیاست چلائے خواہ اس کی وجہ سے اپنی کامیابی کے لئے اس کو کتنی ہی لمبی مدت تک انتظار کرنا پڑے۔ اداکار بالفرض اس کو مصداقت میں ایک جذباتی سیاست کا ماحول ملے تو وہ اپنی مقبولیت کو خطرہ میں ڈال کر فیصلہ کر سکے۔

قومی رہنمائی کے کام کے لیے صرف
انہیں لوگوں کو اکٹھا کیا جیے جو حال کے
اندز مستقبل کو دیکھ سکتے ہوں۔ جن کے
اندز یہ صلاحیت نہ ہو، ان کا قومی رہنما
بن کر اکٹھا، قومی جرم ہے نہ کہ قومی خدمت

چودھری خلیق الزماں (۱۹۴۲-۱۸۸۸)

پاکستان تحریک کے بانیوں میں سے تھے، انہیں اپنے
 اور پرانا امتداد تھا کہ انہوں نے کہا: ”ہندو سے زیادہ سیت
 میرا کوچران جانتا ہے۔“ انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے
 جس میں دکھایا ہے کہ پاکستان کے اصل بانی وہی تھے۔
 یہ انہیں کا تخیل تھا اور اس وقت تھا جب کہ مسٹر جناح
 بھی اس کے خلاف تھے۔

مگر آخر عمر میں چودھری صاحب کو یہ احساس
 ہو گیا کہ انہوں نے تقسیم ملک کی جو تحریک چلائی وہ غلط
 تھی۔ منقبت روزہ ترجمان اسلام لاہور (۱۲ اپریل ۱۹۶۲ء)
 میں ان کا ایک انٹرویو چھپا تھا، اس سے پھر روزنامہ
 جنگ میں نقل ہوا۔ اس انٹرویو کا ایک حصہ یہ تھا:

”ممتاز مسلم لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں نے
 روزنامہ جنگ کے نمائندہ کو ایک ملاقات میں انٹرویو
 دیا اور برصغیر کی تقسیم کے بارے میں تفصیل سے اظہارِ خیال
 کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ موجودہ حالات پر غور کرنے
 سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تقسیم کرنا اگر ہندوستان کے مسلمانوں
 کو کمزور کیا اور جن عظیم مقاصد کے لیے پاکستان قائم کیا تھا
 وہ بھی حاصل نہ ہو سکے۔ اب ہم ایک کوزہ میں بند ہو گئے
 ہیں۔ ہندوستان میں اب بھی ۵-۶ کروڑ مسلمان ہیں۔
 جن کی ہم کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں کون

کہہ سکتا ہے کہ تقسیم ہند کرنا کریم نے کوئی فائدہ حاصل کیا۔“
 روزنامہ جنگ، راولپنڈی، ۳۰ اپریل ۱۹۶۲ء صفحہ ۲
 اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ موجودہ
 زمانے میں ہمارے تمام قائدین، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی
 چودھری خلیق الزماں ہی کی مثال ثابت ہوئے ہیں فرق
 صرف یہ ہے کہ بعض لوگ مرتے ہوئے چودھری صاحب
 کی طرح اپنا اقرار نامہ لکھ کر قوم کو دے گئے۔ اور بیشتر
 کا حال یہ رہا کہ آخر وقت تک وہ بھی کہتے رہے یا کہہ
 رہے ہیں کہ انہوں نے جو راہ اختیار کی وہی صحیح ترین
 راہ تھی، حالات کے بگاڑ میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہیں۔

زندگی کا

راز

جو کم پر راضی ہو جائے
 وہی زیادہ پاتا ہے۔
 جو زیادہ کے لئے دوڑے
 وہ کم سے بھی محروم رہتا ہے
 اور زیادہ سے بھی۔

طاقت کا خزانہ آپ کے اندر ہے

نیپولین کا نام فوجی تاریخ میں عظمت کا نشان ہے۔ مگر وہ ایک پستہ قد آدمی تھا اگرچہ فربہ اندام تھا۔ ایک دن وہ پریڈ گراؤنڈ میں معمولی لباس میں کھڑا تھا۔ اسے میں اس کا ایک فوجی پیچھے سے آیا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ کوئی معمولی سپاہی ہے، نیپولین کے اوپر سے ہائی جبب گر گیا۔ اس کے بعد وہ فخریہ انداز میں پلٹا اور کھڑے دالے شخص کے سامنے سے اس کے چہرہ پر نظر ڈالی تو وہ نیپولین تھا جو سنجیدگی کے ساتھ اپنے فوجی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوجی نے جب اس طرح چپکے سے غلطی نہ کی تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور فوراً مر گیا۔

معلوم ہوا کہ طاقت کا اصل سرچشمہ خود آدمی کا اپنا احساس ہے۔ وہی نیپولین ہے اور وہی فوجی۔ مگر ایک بار وہ نیپولین کے سر سے فخریہ انداز میں بھانڈ جاتا ہے اور دوسری بار اس کو دیکھتے ہیں تب ہی اس کو بتا دیتے ہیں کہ فوراً مر جاتا ہے۔

یہ دونوں احساس کے کرشمے ہیں اگر آپ کا دل بے خوف ہے تو آپ شیر سے لڑ سکتے ہیں اور دریاؤں کو پھلانگ سکتے ہیں۔ لیکن اگر دل میں شبہ اور دھشت پڑا ہو تو گھبراہٹوں کا غول بھی آپ کو بوکھلا دے گا اور معمولی نہریں بھی آپ کو ڈوبانے کے لیے کافی ہوں گی۔

ادھر ہم نے نیپولین کے فوجی کی جو مثال پیش کی ہے، وہ اس صورت حال سے متعلق تھی کہ ایک طاقتور شخص کس طرح دل کی گھبراہٹ کی وجہ سے اپنی موجودہ طاقت بھی کھو بیٹھا ہے۔ اب ایک ایسی مثال لیجئے جبکہ ایک کمزور اور شکست خوردہ آدمی محض دل کی کیفیت بدل جانے کی وجہ سے دوبارہ فتح و کامیابی کا مالک

بن جاتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ کے رابرٹ بروس (ROBERT BRUCE) نے انگلینڈ کے بادشاہ کنگ ایڈورڈ اول کے خلاف بغاوت کر دی تھی جو کہ اسکاٹ لینڈ کے اوپر اقتدار اعلیٰ کا دعویٰ کرتا تھا اس کو ۱۳۰۶ء میں کنگ آف اسکاٹ لینڈ کا تاج پہنا یا گیا۔

اس مقابلہ میں رابرٹ بروس کو بری طرح شکست ہوئی اور اس کو جنگوں اور بیابانوں میں پناہ لینا پڑی۔ مگر ۱۳۱۴ء میں اس نے دوبارہ انگلینڈ کے بادشاہ ایڈورڈ دوم سے بنک برن میں جنگ کی اور اس کو شکست دی۔ اور اسکاٹ لینڈ کو انگریزوں سے آزاد کر لیا۔ اس کے بعد رابرٹ اول کے نام سے اس نے ۱۳۲۹ء تک اسکاٹ لینڈ پر حکومت کی۔

رابرٹ بروس کو شکست کے بعد فتح کس طرح حاصل ہوئی اس کے سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ایک جنگل کے اندر کسی غار میں پڑا ہوا تھا۔ مجھے اب انگلینڈ کے بادشاہ سے مقابلہ کا خیال چھوڑ دینا چاہیے“ اس نے سوچا۔ اس کو اپنی کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ کئی بار کے مقابلہ کے بعد بالآخر وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اتنے میں غار کے اندر ایک چھوٹا سا دانتہ ہوا۔ ایک مکڑی اپنے جالے کے باریک تار سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ رابرٹ بروس کی نظر میں اس کے اوپر جم گئیں۔ اس نے دیکھا کہ مکڑی نے اپنا ایک منٹ ضائع نہیں کیا اور لٹکتے ہوئے تار کے ذریعے دوبارہ اوپر چڑھنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ مگر پھپت کے قریب پہنچتے ہی وہ دوبارہ پھسل کر گر پڑی۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح زمین پر پڑی ہوئی تھی اس طرح وہ بار بار چڑھتی اور بار بار گرتی رہی۔ مگر وہ

ہمت نہیں ہاری اور ہر بار دوبارہ اسی کام میں مشغول ہو جاتی جس میں وہ اس سے پہلے ناکام ہو چکی تھی۔

رابرٹ بروڈس اس کے ناکام تجربات کو گنتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ نوے بار زمین پر گری تو اس کو ہنسی آگئی۔ اب یہ کثیر امزید کوشش کی حماقت نہیں کرے گا۔ اس نے کہا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مکی نے ایک لمحہ ٹھہرے بغیر دسویں بار پھر اپنی جدوجہد شروع کر دی۔

اس بار رابرٹ بروڈس کے سامنے دوسرا منظر تھا اس نے دیکھا کہ مکی ہی منزل سے بہت قریب پہنچ گئی ہے وہ دھیرے دھیرے چڑھتی رہی یہاں تک کہ جب فاصلہ بہت قریب آگیا تو اس نے آخری چھلانگ لگائی اب وہ اپنے جالدار مکان کے اندر تھی۔

”خوب“ رابرٹ بروڈس چلا یا ”وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو بہت نہ ہاریں اور مسلسل اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے رکا اور پھر بولا ”ایک معمولی کیزے نے مسلسل کوشش سے اپنی بازی جیت لی۔ پھر میں کیوں ایسا نہیں کر سکتا۔“

رابرٹ بروڈس غار سے نکل کر باہر آیا۔ اس نے آفری فیملر کن مقابلہ کے لیے تیاری شروع کر دی۔ وہ نئے عزم کے ساتھ شاہ انگلینڈ سے لڑا اور اس بار اس نے فتح حاصل کر لی۔

حقیقت یہ ہے کہ ”میں ایسا نہیں کر سکتا“ محض ایک بزدلانہ فقرہ ہے ہر شخص ہر کام کر سکتا ہے اور ہر شکست دوبارہ نئی فتح میں تبدیل ہو سکتی ہے بشرطیکہ مسلسل جدوجہد کرنے کا عملہ پیدا ہو جائے۔

سیب کا سبق

ایک ٹن سیب سے کتنا عرق نکالا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی پھلوں کا ماہر آپ کو بتائے گا کہ ۶۰ سے ۶۵ کلو گرام تک۔ مگر سیب میں حقیقتاً اس سے بہت زیادہ عرق ہوتا ہے۔ محققین نے دریافت کیا ہے کہ موجودہ ذرائع کے تحت جب ہم سیب کو مکمل طور پر چوڑے چکے ہوتے ہیں، اس کے بعد بھی اس کے اندر ایک ٹن میں ۱۰۰ سے ۱۲۰ کلو گرام تک عرق باقی رہتا ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے کو کھواچھے نہیں ہیں۔ نہیں۔ اگر ہم سب سے طاقتور برقی کوٹھو استعمال کریں جب بھی عرق کی مقدار میں بس برائے نام ہی فرق آئے گا۔ سیب کے اندر بچا ہوا عرق پھر بھی ہمیں حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیب کے خلیوں کا پھلکا بے انتہا دباؤ کے تحت بھی رہے گا ویسا ہی رہتا ہے۔ اور کوٹھو میں پس بچا کے باوجود اس کا عرق خلیوں کے اندر محفوظ رہتا ہے موجودہ حالت میں دباؤ اور طاقت کا اضافہ اس مسئلہ کو حل نہیں کرتا۔

یہ سیب کا قصہ ہے مگر اسی کے اندر آپ قوموں کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک قوم وہ ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی دباؤ کی زد میں آجائے تو آخری حد تک انحراف کر رہ جاتی ہے۔ مگر زندہ قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اگر وہ ظلم و ستم کے کوٹھو میں پل دی جائیں جب بھی سیب کی طرح، ان کے اندر زندگی کی رقی باقی رہتی ہے اور موقع پاتے ہی وہ دوبارہ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔

اس کا اخبار وہاں بھی پہنچ رہا تھا جہاں وہ نہود نہیں پہنچ سکتا تھا

روسی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کا ایک چھوٹا سا
واقعہ ہے مگر اس کے اندر بہت بڑی نصیحت چھپی
ہوئی ہے۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب روس میں اکتوبر
۱۹۱۷ء کا انقلاب نہیں آیا تھا روس میں بالشویکوں کی قیادت
کا قدیم نام کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لیے
شہنشاہ روس (زار) نے بالشویک پارٹی کو خلاف قانون
قرار دے دیا تھا۔ اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کے نام
گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے تھے۔

کچھ لیڈر گرفتار ہوئے، کچھ بچ کر جنگلوں اور
غاروں میں روپوش ہو گئے۔ انھیں روپوش ہونی والوں
میں بالشویک پارٹی کا عظیم لیڈر لینن بھی تھا۔ لینن نے
جنگلوں اور غاروں کے ایک دور افتادہ علاقہ کو اپنا
مسکن بنایا اور وہاں روپوش ہو کر اخبار نکالنا شروع
کر دیا۔ یہ اخبار دستی پریس میں چھاپ کر دستی طور پر روس
کے شہروں میں خفیہ طور پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔ ایک شخص ایک روسی
شہر میں پنساری کے یہاں کچھ سامان خریدنے گیا جب
وہ سامان خرید کر گھر لایا اور پڑیا کھولی تو اچانک اس
کی نظر پڑیا والے کاغذ کے چھپے ہوئے الفاظ پر پڑی۔ یہ
ایک اخبار کا ٹھٹھا ہوا صفحہ تھا جس میں آتشیں الفاظ اور
گرم اگر م عنوان کے ساتھ ایک عبارت چھپی ہوئی تھی۔

روسی کے اس ٹکڑے چھپی ہوئی عبارت پر ہر
اس آدمی کے اندر عجیب کیفیت پیدا ہوئی، وہ بار بار اس
کو پڑھتا رہا اور اس سے اپنے دل کو گرماتا رہا یہاں تک
کہ اسے خیال ہوا کہ معلوم کرے کہ اس عبارت کا مصنف
کون ہے اور یہ کس اخبار کا ٹکڑا ہے جو پنساری کی موت
اسے ملے۔

وہ تلاش میں لگ گیا۔ جو بندہ یا بندہ۔ بالآخر
اسے معلوم ہوا کہ یہ روسی کا ٹکڑا لینن کے اس اخبار کا
ٹھٹھا ہوا صفحہ ہے جو وہ روپوش ہو کر نکال رہا ہے۔

اب اس کا اشتیاق اور بڑھا اور وہ تلاش کرتا
ہوا اس غار میں پہنچ گیا جہاں چھپ کر لینن اخبار نکال رہا
تھا۔ اس کے بعد سے آخر تک وہ لینن کا ساتھی بنا رہا۔ اس طرح
کے کتنے لوگ ہیں جن کو لینن نے صرف اپنے اخبار سے متاثر کیا
لینن زار کی پولیس سے بچنے کے لیے غار کے
اندر روپوش تھا مگر اپنے اخبار کی بدولت وہ ہر شہر میں
پہنچا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ بازار میں پنساری کی دکان بھی اس
کے حق میں پروپیگنڈے کا مرکز بنی ہوئی تھی اس کا اخبار
وہاں بھی پہنچ رہا تھا، جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ ہے موجودہ زمانے میں پریس کی قوت۔ مگر
حیرت انگیز بات ہے کہ پچاس برس پہلے باشعور لوگوں
نے اس سے جو کام لیا تھا ابھی تک ہم وہاں بھی نہیں
پہنچے ہیں اور آج کی زندہ قومیں پریس سے جو کام لے
رہی ہیں اس کی تو عام مسلمانوں کو خبر بھی نہیں حقیقت
یہ ہے کہ اس معاملے میں دوسری قومیں ہم سے اتنا آگے
ہیں کہ ہم ان کے پیچھے بھی نہیں۔ پیچھے ہونے کا مطلب
تو یہ ہے کہ ہم بھی کہیں ہیں۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم
ان کی نسبت سے کہیں نہیں ہیں۔

جو بات ایک شخص اپنی ذات کے بارے میں جانتا ہے وہی بات قوم کے بارے میں بھول جاتا ہے

استحقاق کی دنیا ہے، مطالبات کی دنیا نہیں۔

مگر یہی بات جو ہر آدمی اپنے ذاتی معاملہ میں جانتا ہے، قومی معاملہ میں وہ اس سے بے خبر ہے، جہاں کسی شخص کو قوم کا درد اٹھا اور وہ اصلاح کے میدان میں کھڑا ہوا، فوراً ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک اور سر پیدا ہو گیا ہے جو باطل و دوسرے ڈھنگ سے سوچتا ہے۔ اب وہ ”تیاری“ کے بجائے ”مطالبہ“ کو کامیابی کا مار سمجھنے لگتا ہے۔ مفروضہ حریف کے خلاف پرجوش تقریریں کرنا، تار اور میمورنڈم بھیجنا، مطالبات کے ریڈولیشن پاس کرنا، بین الاقوامی اداروں میں اپنا کیس لے جانے کی اسکیمیں بنانا، یہی اس کی تمام سرگرمیوں کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہی شخص جو اپنی اولاد کے بارے میں جانتا تھا کہ کامیابی صرف اس طرح ملتی ہے کہ پہلے اس کے لئے صلاحیت اور استعداد پیدا کی جائے، وہی شخص قوم کی اولاد کے بارے میں اپنی ساری سرگرمیوں کا نقشہ اس طرح بنا تا ہے گویا تقریر اور مطالبات ساری کامیابیوں کا مار ہیں۔ یہ لا حاصل جدوجہد بالآخر جب ناکام ہو جاتی ہے تو وہ ہمت نہیں ہارتا۔ اب وہ اپنی مطالباتی جہم کو جاری رکھنے کے لئے نیا لفظ ڈھونڈ لیتا ہے:

”ہم کو پس ماندہ قرار دے کر استحقاق کے بغیر ہی تمام مناصب پر بٹھا دو“ ایسے لوگوں کو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ وہ دوسرے رکھنے والے لوگ ہیں۔

اس مزاح کے معاملہ میں کسی مسلم قوم کی کوئی خصوصیت نہیں۔ ہر علاقہ کے مسلمان اسی دھڑی ذہنیت کا شکار ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا ”دوسرا سر“ ایک کے خلاف کام کر رہا ہے، کسی کا دوسرے کے خلاف۔ ایسے لوگ ممکن ہے وقتی لیڈری حاصل کر لیں مگر ان کے اس عمل کی کوئی قیمت نہ تاریخ کے نزدیک ہے اور نہ خدا کے نزدیک۔

طرابلس کے محقق (میوزیم) میں ایک بکری رکھی ہوئی ہے جس کی گردن کے اوپر دوسری ساس کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا، اگر ایک شخص اس کو دیکھ کر آئے اور آپ اس سے پوچھیں کہ سب سے عجیب چیز محقق میں تم نے کیا دیکھی، تو شاید وہ جواب دے گا کہ ”دوسروں والی بکری“ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ میں نے سب سے عجیب چیز جو دنیا میں دیکھی وہ دوسروں والے انسان ہیں۔ طرابلس کے محقق میں تو صرف ایک ایسی بکری ہے جس کے دوسرے ہیں۔ مگر میں نے اپنی ساری عمر میں جتنے انسان دیکھے سب دوسرے رکھنے والے انسان تھے۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کو مثال سے سمجھئے۔

آپ کا ایک لڑکا ہے۔ آپ اس کو کامیاب ڈاکٹر دیکھنا چاہتے ہیں آپ کیا کریں گے۔ آپ اس کو اسکول میں داخل کریں گے۔ بیاہوگی کے ساتھ ہائی اسکول کرائیں گے۔ پھر بی، ایس، سی کرائیں گے۔ پھر اس کو ایم بی بی ایس کے کورس میں داخل کریں گے۔ پھر آپ کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کو این آر سی ایس کرنے کے لئے لندن بھیجیں۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ہی آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دنیا میں اپنی جگہ بنائے۔ آپ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ وہ اپنے لڑکے کو یوں ہی چھوڑ دے کہ وہ کھیلتا کودتا رہے۔ اس کے بعد جب وہ ۲۵ برس کا ہو جائے تو اس کا باپ اس کو ڈاکٹر بنانے کے حق میں پرجوش تقریریں شروع کر دے، وہ حکومت کو تار بھیجے کہ میرے لڑکے کو اسپتال میں سرجن مقرر کر دو۔ یا یہ کہ اس کے ”پس ماندہ“ قرار دے کر ڈگری کے بغیر ڈاکٹر تسلیم کر لو۔ آپ میں سے ہر شخص خوب جانتا ہے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا لڑکا تعلیمی اور تربیتی کورس کو پورا کرے۔ محض مطالبہ کرنے سے کوئی شخص کبھی ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ یہ دنیا

سوچ کر زندگی گزاریے

کے ایک بزرگ تھے۔ نہایت ذہین اور معاملہ فہم۔ ان کے عزیزوں میں ایک شخص اکثر گھر کے اندر عورتوں اور بچوں میں بٹھا کرتے تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے جب کئی بار ان کو اس طرح دیکھا تو ایک روز بگڑ کر فرمایا: ”عورتوں میں مت بیٹھو اس سے عقل کم ہو جاتی ہے“

یہ قول حال میں مجھے اس وقت یاد آیا جب میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ وہ اس سے پہلے ایک معمولی ملازمت میں تھے۔ پچھلے دو برس سے انھوں نے ملازمت چھوڑ کر ایک کاروبار کر لیا ہے۔ جب میں ان سے ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کے کل اور آج میں بہت بڑا فرق ہو چکا ہے۔ ملازمت کے زمانے میں وہ دبے اور بھنے ہوئے شخص دکھائی دیتے تھے۔ بہت کم کوئی سمجھ داری کا جملہ ان سے سننے میں آتا تھا۔ مگر اب جو میں نے دیکھا تو ان کے اندر ایک اعتماد اہل رہا تھا۔ اور بات بات میں سمجھ داری کی باتیں ان کی زبان سے نکل رہی تھیں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ آدمی جیسی زندگی گزارتا ہے، اسی کے لحاظ سے اس کی عقل کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ جو شخص عورتوں اور بچوں میں اپنا وقت گزارے، ظاہر ہے کہ اس کی گفتگو کے موضوعات بالکل معمولی ہونگے۔ گھر پر تھے، فیشن، ہنسی مذاق، کھانا پکڑا وغیرہ۔ اس قسم کی باتوں میں مشغول رہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا ذہن اونچے اور گہرے مسائل میں غور و فکر کی تربیت نہیں پاسکے گا۔ اسی طرح ملازم کی زندگی ایک لگی بندھی زندگی ہوتی ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مہینہ پورا کرے تو اس کو مقررہ تنخواہ ہر حال مل جائے گی۔ اس زندگی کی وجہ

سے اس کے اندر ایک قسم کا ذہنی ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس تجارت ایک ایسا کام ہے جس میں ہر وقت آدمی کی محنت اور صلاحیت کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ ہر دن اس کو نئے نئے حالات سے نمٹنا پڑتا ہے۔ یہ چیز حالات سے لڑنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس کی عقل کو جلا دیتی ہے اس کو بار بار زندگی کی خوراک دیتی رہتی ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ اپنی زندگی کا مسئلہ طے کرتے وقت یہ ضرور سوچے کہ وہ اسکی زندگی کی تربیت کس طرح کرے گا۔ وہی مسئلہ ایک انسان کے لیے صحیح مسئلہ ہے جس میں اس کی چھٹی ہوئی صلاحیتیں ابھریں، اس کے ذہن کا افق وسیع ہو، اس کے اندر خود اعتمادی کی پرورش ہو سکے، وہ دنیا میں وہ تمام ”رزق“ پاسکے جو خدا نے یہاں اس کے لیے مہیا کر رکھا ہے۔

انسانی ذہن حیران کن حد تک بے پناہ صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اگر ہم درست مسئلہ اختیار کریں تو ہمارے ذہن کی ترقی ہماری زندگی کی آخری سانس تک جاری رہیگی، اس کے امکانات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کو کسی محدود یا ناقص مسئلہ میں بند کر دیں تو وہ ٹھیکر کر رہ جائے گا۔ پانی ایک گڑھے میں ہو تو وہ گھٹے کر رہ جاتا ہے، مگر وہی پانی جب دریا میں رواں ہوتا ہے تو سیلا بن جاتا ہے۔

یہ اتفاقی غلطی کا نتیجہ تھا

کارلوس اپنی فوجوں کے زبردست ہائی نقصان کی وجہ سے سپانی کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ سلطان ٹیپو کا یہ اقدام وقتی طور پر اس کے جاسوسی نظام کی کمی کا سبب ہو سکتا ہے۔ تاہم ٹیپو کی تسکست یا اٹھارویں صدی کے آخر میں مشرقی اقوام کی مغربی اقوام کے مقابلہ میں سپانی اس قسم کی کسی جزدی یا اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہ تھی۔ یہ دراصل جدید قوتوں میں مغرب کی سبقت اور مشرق کی پس ماندگی تھی جس نے ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب کر دیا

تاریخ میں کوئی فیصلہ دینا ایک بے حد نازک کام ہے۔ کیوں کہ بہت سے بظاہر یکساں اسباب میں سے کسی ایک سبب کو وہ فیصلہ کن عامل قرار دینا پڑتا ہے جس کے ذریعہ دوسرے اسباب کو سمجھا جاسکے۔ اگر فیصلہ کن سبب کو متعین کرنے میں غلطی ہو جائے تو تاریخ کا مطالعہ محض قصہ کہانی کا مطالعہ بن جاتا ہے بجائے اس کے کہ وہ ہم کو کسی حقیقی سبب تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ اپنی کمزوری کو دوسرے کے اوپر ڈالتے کی کوشش آدمی کو تاریخ کے حقیقی سبق سے محروم کر دیتی ہے۔

سبقتی ایس۔ گڈوانی ہندستان کے شہری پرلاز کے حکم کے ڈائریکٹر جنرل میں مائٹھوں نے اپنی ایک تازہ کتاب میں میسور کے سلطان ٹیپو (۱۷۹۹-۱۷۵۱) کے حالات نادل کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس تاریخی نادل کا نام ہے "ٹیپو سلطان کی شمشیر" یہ کتاب انھوں نے ہند، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، ترکی اور ایران کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں اٹھارہ سال تک تحقیق کرنے کے بعد تیار کی ہے۔ مسٹر گڈوانی نے ٹیپو سلطان کو "درجہ اولیٰ کا قوم پرست" قرار دیا ہے۔ ان کا فیصلہ ہے کہ ٹیپو اٹھارویں صدی کا واحد ہندوستانی حکمران ہے جس نے کسی بھی وقت اپنے ہم وطنوں کے خلاف جنگ میں انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا۔

مسٹر گڈوانی نے لکھا ہے کہ "۱۷۹۲ء کے مرنگا پٹم کے محاصرہ میں ٹیپو نے انگریزوں کے ساتھ صلح کی جو باجیت شروع کی وہ محض اپنے جنرل میرصادق کی پیدا کردہ غلط فہمی کی بنیاد پر تھی۔ حالانکہ اس وقت برطانوی جنرل

عام تصویر یہ ہے کہ کسی "قدیم" تہذیب کو دوبارہ "جدید" نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح آدمی کو جوانی صرف ایک بار ملتی ہے، اسی طرح تہذیب کو بھی صرف ایک بار عروج نصیب ہوتا ہے۔ اس کے بعد تہذیب پر بڑھاپا آ جاتا ہے۔ اور جو بوڑھا ہو گیا اس کو دوبارہ جوان نہیں کیا جاسکتا۔

نگر چین کی مثال نے اس مفروضہ کی تردید کر دی ہے۔ نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار جیمز رستون (JAMES RESTON) نے سیکینگ میں اپنے طویل قیام کے بعد اپنے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ایک رپورٹ تیار کی ہے جس کا عنوان ہے

NEW LOOK OF AN ANCIENT LAND

اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "چین کی قدیم ترین تہذیب کے بارے میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ یہ کہ آج وہ دوبارہ جوان نظر آتی ہے۔ ایک امریکی مشاہد کے نزدیک چین کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا "شباب" ہے۔

اسلامی مرکز کی اشاعتی مہم : عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

دین کیا ہے	از	مولانا وحید الدین خاں	Rs. 1.50
الاسلام	"	"	12.00
تجدید دین	"	"	2.00
ظہور اسلام	"	"	12.00
اسلامی زندگی	"	"	"
زلزلہ قیامت	"	"	3.00
تاریخ کا سبق	"	"	2.00
تعمیر ملت	"	"	2.00
مذہب اور جدید چیلنج	"	"	13.50
اسلامیات	"	"	2.00
عقلیات اسلام	"	"	2.00
اسلام دین فطرت	"	"	2.00
تعلیمات قرآن	"	"	2.00
قرآن کا مطلوب انسان	"	"	"

ماہنامہ الرسالہ
تعمیری اور اصلاحی مضامین کے مستقل مطالعہ کے لئے
ذرتعاون سالانہ 24.00

MAKTABA AL-RISALA, JAMIAT BUILDING, QASIMJAN STREET, DELHI 110006

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qaslmjan Sreet, DELHI-110006 (INDIA)

ظہور اسلام

تالیف :

مولانا وصیر الدین خاں

صفحات ۲۰۰ — قیمت بارہ روپے
آفسیٹ کی اعلیٰ طباعت کے ساتھ
جدید اسلامی لٹریچر میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

مکتبہ الرسالہ

جمعیتہ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دلی ۱۱۰۰۰۶